تذکرہ

علامہ رفیق احمد صاحب

شیخ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد

از قلم

مولانا ممشاد علی قاسمی

مکتبہ مرشد الامت

بلاسپور ضلع مظفر نگر یوپی

سمجھ سمجھ کے پڑھو داستان عبرت ہوں
کسی حسین کہانی کا اقتباس نہیں

تذکرہ

حضرت علامہ رفیق احمد صاحبؒ

شیخ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد

از قلم
مولانا ممشاد علی قاسمی
ناظم جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور ضلع مظفر نگر یوپی

مکتبہ مرشد الامت
بلاسپور، ضلع مظفرنگر یوپی (251001)

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: تذکرہ حضرت علامہ رفیق احمد صاحبؒ

نام مؤلف: مولانا ممشاد علی صاحب قاسمی

تعداد صفحات: ۹۶

کمپوزنگ: عمران کمپیوٹرس مظفرنگر (0131-442408)

قیمت:

ناشر: مکتبہ مرشد الامت، بلاسپور مظفرنگر (یوپی)

ملنے کے پتے

(۱) فلاحِ دارین بک سینٹر بلاسپور، ضلع مظفرنگر (یوپی)

(۲) کتب خانہ حسینیہ دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

(۳) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

(۴) مسعود پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

(۵) کتب خانہ امداد الغرباء، محلّہ مفتی سہارنپور (یوپی)

(۶) مکتبہ سعیدیہ نزد مظاہر علوم (وقف) سہارنپور (یوپی)

(۷) مکتبہ فیض اشرف جلال آباد، ضلع مظفرنگر (یوپی)

(۸) مکتبۃ الایمان مرکزی مسجد پھونس والی بڑوت، ضلع باغپت (یوپی)

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	کلمات بابرکات	۸
۲	کچھ اپنی سرگذشت	۱۲
۳	پیدائش، خاندان اور ابتدائی تعلیم	۱۷
۴	خانقاہ تھانہ بھون میں داخلہ	۱۷
۵	حفظ قرآن کریم کا آسان طریقہ	۱۷
۶	تعلیم سے بیزاری اور کھیل کود کا شوق	۱۸
۷	ایک اتفاقی واقعہ جو تعلیم میں معاون ہوا	۱۹
۸	نگاہِ مردمؤمن کی تاثیر اور مفتاح العلوم جلال آباد میں داخلہ	۲۰
۹	پڑا پتھر بھاری ہو جاتا ہے	۲۱
۱۰	جلال آباد میں حضرت جیؒ کی اولین خدمت	۲۲
۱۱	دل کی انگیٹھی بھی گرما گئی تھی	۲۲
۱۲	مفتاح العلوم کا پہلا طالب علم	۲۳
۱۳	علاج مرض سے بھی بدتر	۲۵
	ایک ناول کے شوقین طالب علم سے واسطہ	
۱۴	مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ دوسرے طالب علم	۲۶
۱۵	پوری نحو میر تین دن میں پڑھی	۲۶
۱۶	دار العلوم دیوبند میں داخلہ	۲۶
۱۷	دیوبند سے جلال آباد اور بھیسانی کے پیدل اسفار	۲۷
۱۸	ہمت و شوق کی ایک دلچسپ و نصیحت آموز کہانی	
	مرقات اور کنز الدقائق صرف سترہ دن میں کیسے پڑھیں	۲۸

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱۹	اہم ترین ہم درس، رفیق بھی حریف بھی	۲۹
۲۰	آم کے درختوں پر مطالعہ و مذاکرہ	۳۰
۲۱	پندرہ راتیں مسلسل جاگ کر گذاریں	۳۱
۲۲	مفتاح العلوم جلال آباد میں ضمنی تدریس	۳۲
۲۳	حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی زیارت اور بچپن کے بعض واقعات	۳۳
۲۴	شیخ چلی کا تعویذ	۳۴
۲۵	دارالعلوم دیوبند میں ایک جن طالب علم کے یہاں چائے کی دعوت	۳۵
۲۶	دارالعلوم دیوبند سے فراغت اور بھیسانی میں تدریس کے فرائض	۳۷
۲۷	مفتاح العلوم جلال آباد میں تقرر	۳۸
۲۸	بخاری شریف و ترمذی شریف کا درس	۳۹
۲۹	درس ترمذی شریف کا خاص اہتمام	۴۰
۳۰	ماضی کا ایک دلچسپ منظر	۴۱
۳۱	حضرت علامہ صاحب کا ایک یادگار درس بخاری	۴۲
۳۲	ایک علمی نکتہ	۴۳
۳۳	پڑھی ہوئی تمام کتابیں پڑھائیں	۴۴
۳۴	ایک اہم نصیحت	۴۴
۳۵	طلباء کے مدرسہ سے اخراج پر حضرت علامہ صاحب کی رائے	۴۵
۳۶	کامیابی ہمیشہ نرمی سے ملتی ہے	۴۶

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۳۷	شقی ازلی اور سعید ابدی، ایک سبق آموز واقعہ	۴۷
۳۸	طالب علم کی غلط راہ پر پڑنے سے حفاظت	۴۸
۳۹	طلباء کو تنبیہ سے متعلق ایک واقعہ	۴۸
۴۰	عمومی احترام اور بلند اخلاقی	۵۰
۴۱	تدریس کے ساتھ مدارس کی سرپرستی	۵۱
۴۲	سفر سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ	۵۱
۴۳	سائیکل سے سفر	۵۲
۴۴	دور افتادہ بستیوں کے اسفار	۵۲
۴۵	نیند پر اختیار	۵۳
۴۶	ہمدردی و خیر خواہی	۵۳
۴۷	تقریر و بیان کا ملکہ	۵۴
۴۸	غریبوں کی دعوت	۵۵
۴۹	عظمت اخلاق کا ایک واقعہ	۵۵
۵۰	جلال آباد میں تدریس	۵۸
۵۱	فریب و تدبیر کے فرق پر گفتگو	۵۸
۵۲	خلوت کا اثر	۵۹
۵۳	مدرسہ کے لئے اسفار	۶۰
۵۴	مفتاح العلوم جلال آباد سے علیحدگی کا المیہ	۶۰
۵۵	زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اور ظرف و حوصلہ کا امتحان	۶۲
۵۶	ایک شریف اور اعلیٰ ظرف انسان	
	،حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کی شہادت	۶۴

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۶۴	پیکر صبر و رضا	۵۷
۶۵	تلخیٔ زیست تبسم میں چھپالیتا ہوں	۵۸
۶۶	جلال آباد سے محبت	۵۹
۶۷	خودداری اور استغناء کا امتحان	۶۰
۶۷	دستارِ علم کے وقار کی حفاظت	۶۱
۶۹	مفتاح العلوم میں رہائش	۶۲
۶۹	مکاں کو ہے زینت مکین سے اسدؔ	۶۳
۷۰	تفریح کا شوق	۶۴
۷۱	نرم دلی کی ایک مثال	۶۵
۷۱	حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے اجازت وخلافت	۶۶
۷۳	میکدے کی راہ سے ہو کر گذر گیا	۶۷
۷۳	دل کی دنیا آباد رہی	۶۸
۷۴	حضرت مہتمم صاحبؒ کا معیارِ نظافت	۶۹
۷۴	شیخ فیملی ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے	۷۰
۷۴	سیاسی عزائم اور الیکشن کی تیاری	۷۱
۷۶	جدید تعلیم سے متعلق خیالات	۷۲
۷۶	تنگ نظری کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں	۷۳
۷۸	مسلمانوں کی ایک بدقسمتی	۷۴
۷۹	مدارس کے ساتھ جدید تعلیم گاہوں، ہسپتالوں اور دار القضاء کی ضرورت	۷۵

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۷۶	جماعت عادلہ اور شرعی پنچایت	۸۰
۷۷	مدارس کے طلباء کو ہندی، انگریزی کی ضرورت	۸۱
۷۸	حضرت علامہ صاحبؒ سے ایک یادگار مکاتبت	۸۲
۷۹	ایک اہم خط مع عکس تحریر حضرت علامہ رفیق احمد صاحبؒ	۸۳
۸۰	جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور سے انسیت	۸۷
۸۱	مشعلِ راہ	۸۷
۸۲	محبت وعنایت کے پھول	۸۸
۸۳	دارالعلوم (وقف) دیوبند میں درس حدیث	۹۰
۸۴	مظاہر علوم (وقف) میں تدریسی خدمات	۹۰
۸۵	حضرت علامہ رفیق احمد صاحبؒ، رفیق اعلیٰ کے حضور میں	۹۱
۸۶	آخری وقت	۹۲
۸۷	آخری آرام گاہ	۹۲
۸۸	مسلم راجپوتوں کا رہنما	۹۳
۸۹	پسماندگان	۹۴

کلماتِ بابرکات

فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم

ناظم اعلیٰ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، امابعد! مغربی یوپی کے مشہور و معروف اور ممتاز عالم دین حضرت علامہ رفیق احمد صاحب علیہ الرحمۃ کا ''تذکرہ'' مولفہ محب محترم گرامی قدر مولانا ممشاد علی قاسمی، نظر نواز ہو کر قلبی مسرت کا باعث بنا۔

سیرۃ الانبیاء سے لیکر حضرات صحابہؓ و تابعینؒ، ائمہ سلفؒ، اور علماء و مشائخ نیز صوفیاء و شہداء کی مبارک زندگیوں کے حالات لکھنے پڑھنے اور سننے سنانے کا معمول چلا آرہا ہے۔

اہل دل اور کامل بندوں کے تذکرے اسلام کی عملی زندگی کا راستہ آسان بنانے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں، ان کے مطالعہ سے آدمی کے اندر صفات ذمیمہ مغلوب و مضمحل ہوتی ہیں اور محاسن قوی و مستحکم، نفس اور شیطان کا تسلط کمزور ہوتا ہے اور فکر آخرت والی زندگی گزارنے کا شوق پختہ، دنیا کی بے ثباتی قلب و نظر میں سما جاتی ہے، اور رضائے الٰہی تمام کاموں کا مقصد و منشاء بن جاتا ہے۔

حضرت علامہ رفیق احمد صاحب کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور قابل رشک تھی۔ انہوں نے اپنی مبارک زندگی کے آخری ایام جامعہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور میں گزارے۔ یہاں انہوں نے بخاری شریف کا درس دیا اور اپنی باوقار علمی شخصیت کا لوہا منوالیا۔

اگرچہ علامہ رفیق احمد صاحب نے مظاہر علوم میں اپنی عمر کے آخری تین

سال ہی گذارے لیکن ہمیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہ ابھی آئے ہیں بلکہ ان کے انتہائی مخلصانہ اور اپنائیت سے بھرپور رہن سہن کے انداز سے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ وہ بچپن سے ہی ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ سے مظاہر علوم ہی میں رہتے ہیں۔ وہ دل سے ساتھ دینے والے انسان تھے، ہمارے ساتھ وہ صحیح معنی میں رفیق بن کر رہے۔ مدرسہ کے اس بحرانی دور میں انھوں نے دل وجان سے مدرسہ کی خدمات انجام دیں اور ذمہ دارانِ مدرسہ کی سچی رفاقت کا حق ادا کیا۔ ان کے یہاں رہنے سے سب کو بڑا حوصلہ اور ڈھارس تھی۔

ان کے کمرہ میں اکثر اوقات واردین وصادرین کا تانتا بندھا رہتا، جن میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی جو دینی جلسوں میں خطاب کے لئے علامہ صاحب سے تاریخ اور وقت کے طالب ہوتے۔

علامہ صاحب اپنے مہمانوں کا اکرام فرمایا کرتے تھے، لیکن وہ ان کی ضیافت صرف چائے ناشتہ سے ہی نہیں کرتے تھے بلکہ پند ونصائح اور علم وعمل کی بیش قیمت باتیں سنا کر حقیقی میزبانی کا فریضہ انجام دیتے۔ ان کے پاس مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ آتے، ان سے اپنے اپنے مسائل اور الجھنوں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے، علامہ صاحب اپنائیت اور ہمدردی سے ان کی پریشانیاں سنتے اور مناسب مشوروں سے نوازتے، اس طرح ہر آدمی صلاح ومشورہ کے بعد مطمئن ہو کر واپس لوٹتا، باہم حریفانہ چپقلش والے لوگ بھی حضرت علامہ صاحب کے ساتھ یکساں احترام کا معاملہ کرتے، ان کو مرکزیت ومرجعیت کا ایک بلند مقام حاصل تھا، ان کی اس وجاہت کے باعث مدرسہ کا وہ حجرہ جس میں وہ قیام فرماتے تھے آج بھی ’’علامہ صاحب والا کمرہ‘‘ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

علامہ صاحب بڑے ذہین تھے، ان کو علم تفسیر وفقہ کے علاوہ علم حدیث پر عبور اور اس مقدس ومبارک علم میں خاص شغف وانہماک کی سعادت حاصل تھی۔ یہاں پر درس حدیث کی خدمات ان کے سپرد تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو

انتظامی امور کی بھی اعلیٰ امور صلاحیتوں سے نوازا تھا، اس لئے جذبۂ ہمدردی کے ساتھ وہ مدرسہ کے انتظامی امور میں بھی گرانقدر مشوروں سے نوازتے اوران کو عملی جامہ پہناتے وقت بھر پور تعاون فرماتے تھے۔ وہ موقعہ بموقعہ مدرسہ کی شاخوں اور مختلف شعبہ جات کی نگرانی کے امور میں فعال کردارادافرماتے اوراپنی گوناگوں خصوصیات اور ہر دلعزیز شخصیت کے باعث اساتذہ وملازمین، طلبۂ عزیز اور باشندگان شہر سبھی کے نزدیک قابل تکریم تھے۔

تدریس وتقریر کے علاوہ دینی مدرسوں کا قیام ان کا اہم مشغلہ تھا، جس کے ذریعہ انہوں نے دور دور تک لوگوں کو فیضیاب فرمایا، خاص طور پر اپنے قرب و جوار کے ان گاؤں اور قصبات کو جہاں کے لوگ اکثر زمیندار ہونے کی وجہ سے یا تو اپنے بچوں کو صرف عصری تعلیم دلانے پر اکتفاء کرتے یا ان کو ناخواندہ رکھتے۔ علامہ صاحب نے بڑی تعداد میں وہاں مدارس ومکاتب قائم فرما کرلوگوں کو دینی تعلیم کی طرف راغب کیا اوران مدارس سے ہزاروں کی تعداد میں حفاظ وعلماء تیار ہوئے، ان کا یہ کارنامہ حقیقت میں عظیم صدقۂ جاریہ ہے۔

حضرت اقدس مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ) اوران کے مدرسہ سے علامہ صاحب کا چونکہ مدت دراز تک استفادہ وافادہ کا تعلق رہا ہے، اس لئے وہاں کی محبت وعظمت ان کے دل میں پوری طرح قائم تھی، بسا اوقات وہ حضرت جلال آبادی کے واقعات کی روشنی میں نصیحت آمیز باتیں ارشاد فرماتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اور ہمارے تمام بزرگوں کو کروٹ کروٹ چین نصیب کرے، درجات بلند فرمائے، آمین۔

محبِّ محترم گرامی قدر مولانا ممشاد علی قاسمی زید فضلہ ناظم جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور (مظفرنگر) ممتاز صاحب قلم اور فاضل نوجوان ہیں، شستہ اور رواں طرز

تحریر پر دسترس رکھتے ہیں، متعدد تالیفی خدمات ان کی صلاحیتوں پر شاہد عدل ہیں۔

حضرت علامہ رفیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر ان کی تالیف لطیف ان کی عمدہ صلاحیتوں کا عکس جمیل ہے۔ اور یہ کام علمی اصلاحی ذخیرۂ کتب میں ایک مقتدر اضافہ ہے۔

اصل میں یہ کام بھیسانی، جلال آباد، دارالعلوم (وقف) یا مظاہر علوم (وقف) سے ہونا چاہئے تھا، ان اداروں کے لئے حضرت علامہ صاحب کی جو خدمات اور قربانیاں ہیں اس کے پیش نظر ان تمام اداروں پر یہ ایک قرض تھا۔ مؤلف موصوف کو اللہ رب العزت جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے ہم سب کی طرف سے اس ذمہ داری کو انجام دیا۔

بارگاہِ ایزدی میں دست بدعاء ہوں کی یہ محنت مقبول ہو، امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنے اور مؤلف زید مجدہ کے لئے ذخیرۂ آخرت۔ (آمین)

العبد مظفر حسین المظاہری

۲۹ رذی الحجہ ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۴ ر مارچ ۲۰۰۲ء

کچھ اپنی سرگذشت

سن اور مہینہ تو یاد نہیں، البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنی زندگی کے پہلے ہی عشرے میں تھا جب حضرت علامہ رفیق احمد صاحب شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد کو پہلی بار دیکھا، ہم لوگ مدرسہ اشرف العلوم کسیروہ میں پڑھتے تھے مدرسہ کا بھی بالکل ابتدائی دور تھا، سالانہ جلسہ تھا اور حضرت علامہ صاحب جلسہ میں تشریف لے گئے تھے۔ یہ ایک سرسری زیارت تھی پھر ان سے باقاعدہ نیاز جب حاصل ہوا اور ذرا قریب سے دیکھنے کا موقعہ اس وقت ملا جب میں ۱۹۷۵ء میں مفتاح العلوم جلال آباد میں داخل ہوا، علامہ صاحب کی شخصیت، شفقت ومحبت کے خزانوں سے مالا مال اور عفو ودر گذر کی صفات سے بھرپور تھی، جسمانی اعتبار سے بھی ان کا سراپا بہت وجیہ اور متوازن تھا، چہرے پر علمی وقار اور انسانی ہمدردی کے آثار نمایاں تھے بڑھاپے میں بھی صحت اچھی تھی، میں نے کسی پچپن (۵۵) ساٹھ (۶۰) سالہ عالم کو ایسا جوان نہیں دیکھا، وہ ہردم متحرک اور شاداب نظر آتے تھے۔ ان کا اچانک منظر سے غائب ہو جانا علمی دنیا کا بہت بڑا نقصان اور ایک دل دوز سانحہ تھا۔ ان کی زندگی جفاکشی اور خدمات سے عبارت تھی۔

لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا تھا کہ ان کے انتقال کے کئی سال بعد تک بھی ان کی شخصیت اور خدمات سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا، کوئی چھوٹا سا مضمون بھی شائع نہیں ہوا، مجھے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ اس طرح تو علامہ صاحب کی شخصیت وقت کے غبار میں چھپ جائے گی اور اگلی نسلوں کو یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ مظفر نگر میں ایک ایسی دل نواز ہستی بھی گذر چکی ہے۔ میں کبھی کبھی بعض احباب کے سامنے بھی اس کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ میں خود لکھنا چاہتا تھا لیکن اس سلسلہ میں دشواری یہ تھی کہ علامہ صاحب سے متعلق لکھنے کے لئے کوئی

علمی تعاون کہیں سے نہیں مل پا رہا تھا۔

صاحبزادۂ گرامی مولانا مصطفیٰ صاحب نے ایک بار بتایا کہ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''میری تو ساری چیزیں ہواؤں میں ہیں'' پھر اس تاریکی میں روشنی کی ایک کرن اس طرح نمودار ہوئی کہ محترم جناب مولانا مفتی مہربان علی صاحب بڑوتیؒ سے ایک ملاقات کے دوران میں نے کہا کہ علامہ صاحب کا حق ہے کہ ان کی کوئی سوانح یا ایک مفصل مقالہ تحریر کیا جائے جو اگلی نسلوں کو ان کی شخصیت اور خدمات سے روشناس کرا سکے اور میرا بھی کچھ لکھنے کا ارادہ ہے تو مولاناؒ نے پر جوش انداز میں تائید فرمائی اور فرمایا کہ میرے پاس ایک کیسٹ ہے۔ جس میں علامہ صاحب سے ان کے انتقال سے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی ان کی زندگی کے حالات وواقعات کے بارے میں مختلف سوالات میں نے کئے تھے اور علامہ صاحب نے ان کے جوابات دیئے تھے، میں نے وہ گفتگو ٹیپ کرلی تھی۔ وہ کیسٹ محفوظ ہے، میں آپ کے پاس بھیج دوں گا، اس سے بھی کچھ مدد ملے گی۔ چنانچہ انہوں نے چند روز بعد ہی وہ کیسٹ اور اس کے اندر ٹیپ گفتگو الگ سے بھی کاغذ پر نقل کرا کے میرے پاس بھیج دی، یہ ۱۹۹۴ء کی بات ہے اور یہ واحد بامقصد علمی تعاون ہے جو اس کتاب کی تالیف میں مجھے حاصل ہوا کتاب میں جہاں جہاں کیسٹ کی گفتگو نقل کی گئی ہے وہاں حاشیہ میں اس کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔

اس کیسٹ سے حضرت علامہ صاحب کے زمانۂ طالب علمی کے حالات وواقعات خود ان کی زبانی معلوم کرنے میں خاصی مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مہربان علی صاحبؒ کے اس مخلصانہ تعاون علی البر پر ان کو بہترین اجر عطا فرمائے اور ان کی روح کو شاد فرمائے کہ اگر وہ حیات ہوتے تو یقیناً اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

میں نے لکھنے کا ارادہ تو اسی دوران کرلیا تھا لیکن کچھ تو متفرق مصروفیات اور کچھ اس توقع پر کہ کہیں سے کوئی اور مواد حاصل ہو جائے، برسوں گذر گئے۔ اور اس دوران دیگر علمی و تعلیمی مصروفیات کے باعث اس سلسلہ میں لکھنے کا ارادہ عملاً متروک سا ہو گیا۔ پھر ایک دن یونہی علامہ صاحب کی یاد آرہی تھی۔ خالی بیٹھا تھا میں نے قلم سنبھالا اور حضرت علامہ صاحب کی شخصیت اور خدمات کا ایک خاکہ سا الفاظ میں کھینچ کر ماہنامہ ''ارمغان'' میں بھیج دیا۔

اکتوبر ۱۹۹۸ء کے شمارہ میں یہ مضمون شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ بزرگوں اور احباب کی حوصلہ افزائی سے میرے اندر بھی تھوڑی چستی سی آئی، تو میں نے علامہ صاحب سے متعلق اپنی یادداشت کو ٹٹولا اور ذہن میں اس کو ترتیب دے کر قلم کے حوالے کر دیا، میں یونہی شوق شوق میں لکھتا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسط وار مضامین کا ایک سلسلہ علامہ صاحب سے متعلق ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' کے عنوان سے سات آٹھ قسطوں میں ماہنامہ ارمغان میں شائع ہو گیا۔ قارئین سے ملے تاثرات کے مطابق یہ سلسلہ انتہائی مفید، بہت دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ اور اس اعتبار سے اس کی خاص اہمیت تھی کہ حضرت علامہ صاحب کے بارے میں اس سے قبل کہیں بھی کوئی مضمون شائع نہیں ہوا تھا۔ سات قسطیں چھپنے کے بعد بعض حضرات کا اصرار ہوا کہ یہ سب باتیں کتابی شکل میں شائع ہونی چاہئے۔ ایک مضمون کے لکھنے سے بات اتنی بڑھ جائے گی۔ شروع میں اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔

میں نے توریت میں یونہی پھیری تھیں انگلیاں
دیکھا جو غور سے تری تصویر بن گئی

اس سلسلہ میں معلوماتی مواد کی عدم موجودگی اور کوئی علمی یا اخلاقی تعاون نہ ملنے کے باوجود اس کو حضرت علامہ صاحب کی شخصیت کا غیر معمولی تأثر تھا جو قلم

کی زبان سے ظاہر ہوتا رہا، ورنہ بظاہر اس کا امکان نہ تھا کہ یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہوتی۔

بہر حال مجھے بھی خیال ہوا کہ یہ مضامین از سر نو مرتب ہو کر کتابی شکل میں آجائیں تو واقعی ایک مستقل دستاویز تیار ہو جائے گی۔

اسی دوران حرمین شریفین کا سفر ہوا تو جدہ میں برادر گرامی مولانا شمشاد صاحب قاسمی اور محترم جناب مولانا قاری جمیل الرحمٰن صاحب (مقیم ریاض) جو دونوں علامہ صاحب کے شاگرد ہیں۔ ان حضرات سے بھی اس کا تذکرہ ہوا اور میں ان دونوں حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی مخلصانہ فرمائش کی وجہ سے ہی مجھے یہ کتاب آپ تک پہنچانے کی عزت حاصل ہو رہی ہے۔

حضرت علامہ صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ حدیث نبویؐ اور فقہ اسلامی کی تعلیم وتدریس میں گذرا، ان کی دل پذیر اور مؤثر تقریروں کے ذریعہ سالہا سال تک علم ودانش کے موتیوں کی برسات ہوتی رہی۔ سینکڑوں مدارس کے بے لوث خادم، باوقار شیخ الحدیث، ہمدرد سرپرست اور ایک ہر دل عزیز انسان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے یہ ایک ادنیٰ سی مخلصانہ کاوش ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمالے تو اس کے لامتناہی کرم اور بے کراں فضل سے کیا بعید ہے۔

میں نے اس کو ''سوانح'' کے بجائے ''تذکرہ'' کا نام دیا ہے چونکہ میرے خیال میں سوانح کے لئے اس سے زیادہ وسیع عنوانات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد حضرت علامہ صاحب کے شاگردوں اور احباب و متعلقین کی طرف سے ایسا کچھ مستند مواد اور علمی واخلاقی تعاون ہم کو مل جائے جس سے ہمارے لئے مستقل سوانح کی تالیف کی بنیاد اور حوصلہ فراہم ہو جائے، اس سلسلہ میں ہم تمام مخلصین کے رابطہ کے منتظر رہیں گے۔

حضرت علامہ صاحب کے آباء واجداد کی تاریخ اور خاندانی روایات کو میں نے نہیں کریدا، میں چاہتا تو ان دور از کار تفصیلات سے بہت سے صفحات رنگین کر دیتا لیکن میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ علامہ صاحب کی وہ صفات اور ان سے متعلق وہی حالات وخیالات نوک قلم پر لایا ہوں جن سے عملی زندگی میں کوئی نصیحت یا عبرت حاصل ہو سکے، کہ بزرگوں کے تذکرہ کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

والسلام

ممشاد علی قاسمی

جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور

ضلع مظفر نگر۔ یوپی

۱۸/ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ بمطابق ۳/ مارچ ۲۰۰۲ء

پیدائش، خاندان اور ابتدائی تعلیم

حضرت علامہ رفیق احمد صاحب کے لئے اس دنیائے فانی میں ۱۹۲۵ء کے ماہ جنوری کی ۱۰ ر تاریخ کو ان کی زندگی کا اولین دن تھا، زندگی کا یہ سفر انہوں نے یوپی کے خطۂ اولیاء وعلماء یعنی ضلع مظفر نگر میں معروف قصبہ تھانہ بھون سے چار کلومیٹر مشرق میں اپنے آبائی گاؤں بھیسانی اسلام پور سے شروع کیا وہ راجپوت تھے، والد صاحب کا نام مقصود احمد تھا، گھر میں کھیتی باڑی (زراعت) ہوتی تھی کوئی علمی گھرانہ یا گھر میں علمی شہرہ نہ تھا کسانوں کے عام بچوں کی طرح ہی دودھ گھی کھاکر (۱) کسی باقاعدہ خانگی علمی سرپرستی کے بغیر آپ نے گاؤں کے پرائمری اسکول سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ہی خارجی اوقات میں ایک ماسٹر جی، منشی محمد وسیم صاحب جو سروٹ کے رہنے والے تھے ان سے ناظرہ قرآن شریف پڑھا۔

خانقاہ تھانہ بھون میں داخلہ

ابتدائی تعلیم کے بعد حفظ قرآن شریف کے لئے آپ تقریباً گیارہ سال کی عمر میں تھانہ بھون خانقاہ میں داخل ہوگئے اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کی خصوصی نگرانی وشاگردی میں ایک سال میں بخوبی حفظ مکمل کرلیا۔

حفظ قرآن کریم کا آسان طریقہ

مدرسہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں اپنے حفظ قرآن شریف کے زمانے اور طریق حفظ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ صاحب نے بتایا کہ ”کیونکہ میں بچہ تھا خانقاہ میں تو رہنے کی گنجائش نہیں تھی (۲) اس لئے مولانا ظفر احمد صاحب

(۱) یہ دودھ گھی والی بات اسلئے بڑھادی کہ علامہ صاحب اکثر بتایا کرتے تھے کہ والدہ مجھے بہت دودھ گھی کھلایا کرتی تھی، اسی لئے اتنی طاقت ہے۔ (م) (۲) خانقاہ میں کم سن طلباء کا قیام ممنوع تھا۔

کے گھر رہتا تھا، سبق یاد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ مغرب سے عشاء تک مولانا صاحب ایک چارپائی پر لیٹ جاتے تھے اور میں ان کی برابر میں دوسری چارپائی پر بیٹھ کر یاد کرتا تھا، انھوں نے ہمیں ایسے گُر بتلائے تھے کہ حفظ میں کوئی دقت ہی نہیں ہوئی، انہوں نے فرمایا تھا کہ مغرب سے عشاء تک جو یاد کرو تو اس میں ایک منٹ بھی ضائع نہ ہونے دو، ایک آیت کو انتیس (۲۹) مرتبہ پڑھو اور تیسویں مرتبہ پچھلی آیت سے ملا کر پڑھو پھر جتنا سبق ہوا سے جوڑ کر پڑھو، اور عشاء کی نماز پڑھ کر سو جایا کرو اس کے بعد فجر کی اذان پر یا اس سے قبل قرآن شریف پڑھو اور پھر قرآن شریف پڑھ کر اس رات کے یاد کئے ہوئے سبق کو پڑھو تو وہ یاد نکلے گا اور اگر کچھ خامی ہو تو اسے دیکھ کر دور کرلو۔

چنانچہ اس زمانہ میں ہم صبح کو خانقاہ چلے جاتے تھے اور فجر سے پہلے ہی سنا دیا کرتے تھے کبھی ایسا یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے فجر کی نماز کے بعد سبق سنایا ہو، پھر فجر کی نماز کے بعد آموختہ کا وقت مقرر تھا اس کے بعد شام تک دنگا شرارتیں اور کھیل کود میں دن گذرتا تھا اور کبھی کبھی ہمیں کام میں لگائے رکھنے کی خاطر خلیفہ جی (خانقاہ میں علامہ صاحب کے استاذ تھے، اصل نام ''خلیفہ اعجاز احمد'' تھا اور خلیفہ جی کے نام سے متعارف تھے) نورانی قاعدہ پڑھانے کے لئے دیدیا کرتے تھے اور ہم چھوٹے بچوں کو نورانی قاعدہ پڑھایا کرتے تھے۔''

تعلیم سے بیزاری اور کھیل کود کا شوق

حفظ کی تکمیل میں ابھی چھ پارے باقی تھے کہ آپ کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوگیا، اور گاؤں کے عام بچوں کی طرح آپ کو بھی خیال ہوا کہ بس بہت پڑھ لیا، چنانچہ آپ نے اس ادھوری تعلیم کو خیر باد کہہ کر پورا وقت کھیل کود میں صرف کرنے کی ٹھان لی، حضرت علامہ صاحب نے ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے

بتایا کہ ''میں نے خلیفہ جی سے کہہ دیا کہ اب میں نہیں پڑھوں گا انہوں نے ہمارے سر پرست مولانا ظفر احمد صاحب سے شکایت کردی کہ یہ تو بھاگنا چاہتا ہے پڑھنا نہیں چاہتا، چھ پارے اس کے باقی رہ گئے ہیں تو مولانا نے مجھ سے بڑی شفقت سے فرمایا کیوں چھوڑ رہے ہو؟ میں نے کہا حضرت، جی نہیں لگتا، طبیعت نہیں لگتی، فرمایا کہ چھ پارے پڑھنے میں تو کوئی مشکل نہیں، میں نے کہا جی! پھر ایک شرط کے ساتھ پڑھ سکتا ہوں کہ میرا آموختہ بالکل نہ سنیں اور سبق میں مجھے آزادی دیں جتنا میں سبق یاد کر کے سنا سکوں اتنا ہی سنا جائے چاہے ایک پارہ ہو، چاہے آدھا پارہ کتنا ہی ہو، اور جب بھی میرا قرآن شریف پورا ہو جائے اسی دن میری چھٹی کر دیں، تو مولانا نے میری یہ شرط منظور کر کے خلیفہ جی سے فرمادیا کہ جیسے یہ کہے ویسے ہی کرو، آموختہ بالکل نہ سنو، اور اس کا قرآن شریف پورا کرادو، جتنا یہ سبق سنا دیا کرے اتنا ہی سن لیا کرو، کچا ہو یا پکا۔

چنانچہ میں نے آدھا آدھا پارہ کر کے سبقاً سبقاً چھ پارے بارہ دن میں سنا دئے اور میں نے چھٹی کر لی، کیونکہ میری بات پوری ہوگئی تھی، اس کے بعد میں نے دو سال تک قرآن شریف اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اتنی طبیعت کھیل کود میں لگی، کھیت میں بھی، یہاں بھی، وہاں بھی، ہمارے والد صاحب کبھی زجر و توبیخ نہیں فرماتے تھے کیونکہ ڈانٹ ڈپٹ ان کا مزاج ہی نہیں تھا، گھر کے اور باہر کے لوگ کہتے بھی تھے کہ آوارہ ہو گیا ہے، ایسا ہو گیا ہے، ویسا ہو گیا ہے، لیکن والد صاحب فرماتے تھے کہ مقدر میں ہو گا تو پڑھ ہی لے گا کیا ضرورت پڑی......(۱)

ایک اتفاقی واقعہ جو تعلیم میں معاون ہوا

پھر اچانک ایک اتفاقی واقعہ پیش آیا اور بظاہر یہی معمولی واقعہ دوبارہ قرآن

(۱) علامہ صاحب کی ریکارڈ شدہ گفتگو سے اقتباس

شریف کو یاد کرنے اور تعلیم کی طرف متوجہ ہونے کا باعث بن گیا، چنانچہ علامہ صاحب نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''دو سال تک ہم یونہی گھومتے رہے، دوسال کے بعد ایک حافظ صاحب محمد یامین اب بھی زندہ ہیں تھانہ بھون کے پاس مساوی ایک گاؤں ہے ہمارے گاؤں (بھیسانی) کے قریب، وہاں امامت کرتے تھے اور رمضان میں قرآن شریف سنا رہے تھے قرآن کریم پورا ہونے میں ابھی ان کے چھ پارے باقی تھے کہ حافظ صاحب کا سامع کہیں چلا گیا، وہ بہت پریشان ہوئے'' رمضان شریف میں ان کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ بھیسانی میں ایک لڑکا حافظ ہے اور وہ یونہی پھرتا رہتا ہے اس کو بلالو اور سامع بنالو۔

چنانچہ وہ ہمارے دادا کے پاس آئے تو دادا نے کہا کہ اس کے تو کچھ بھی یاد نہیں، انہوں نے کہا اجی تم بلادو، چنانچہ میں آیا تو انہوں نے کہا بھئی قرآن کریم پورا ہونے میں میرے چھ پارے باقی ہیں سارا میں سناتا ہوں اور یہ چھ پارے میرے کچے ہیں وہ تم سن لو، مجھے بھی خیال تھا کہ مجھے قرآن شریف یاد نہیں رہا لیکن میں ان کے اور دادا کے کہنے سے چلا گیا اور میں نے ایک ایک پارہ یاد کرنا شروع کیا تو وہ روزانہ میرے یاد ہو جایا کرتا تھا، پھر حافظ صاحب نفلوں میں میرا پارہ سنتے تھے، اور خود وہ تراویح میں پڑھتے تھے، چھ پارے سنانے کے بعد یہ خیال ہوا کہ یاد ہیں کوئی مایوسی کی بات نہیں پھر میں نے دوبارہ یاد کرنا شروع کردیا۔(۱)

نگاہِ مردِ مؤمن کی تاثیر اور مفتاح العلوم جلال آباد میں داخلہ

تعطل ولاپرواہی کے اس دوسالہ دور میں جو حقیقت میں کسی بھی ہونہار طالب علم کے مستقبل کو تاریکی میں ڈبونے اور اس کو ناکامی کے خندق میں گرانے کے لئے کافی تھا، روشنی کی ایک کرن تھی جو بھیسانی کے اس نوجوان کو تاریکی میں

(۱) کیسٹ سے نقل شدہ۔

گم ہونے سے بچاتی رہی یعنی خانقاہ تھانہ بھون میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب سے برابر تعلق، اور بظاہر یہی پاکیزہ رابطہ ایک کھلنڈرے اور بے فکرے نوجوان کو اندھیری راہوں سے ہٹا کر روشن مستقبل کی طرف گامزن کرنے کا ذریعہ بن گیا، چنانچہ علامہ صاحب نے اس کی تفصیل خود اپنی زبانی اس طرح بیان فرمائی کہ:

''میں اس تعطل کے زمانہ میں مولانا ظفر احمد صاحب کے پاس برابر جاتا رہا، جمعہ کو جاتا اور ان کے پاس بیٹھتا ان کو پنکھا جھلتا اور جو کچھ خدمت ہو سکتی تھی وہ کرتا، وہ مجھے برابر سمجھایا کرتے تھے کہ اب تو کھیل کود سے پیٹ بھر گیا ہوگا پھر سے پڑھنا شروع کردو، دو سال گذار دیئے، چنانچہ مولانا کے فرمانے پر میں نے پھر خانقاہ میں داخلہ لینے کا ارادہ کرلیا تو مولانا نے فرمایا۔ یہاں تو مدرس نہیں ہے اس لئے کہ میں بھی اب ڈھاکہ جا رہا ہوں (مولانا تھانہ بھون سے ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے) یہاں تمہاری دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں رہے گا اور میں تمہیں پرچہ لکھ کر دے رہا ہوں تم جلال آباد چلے جاؤ وہ تم کو مدرسہ میں داخل کرلیں گے۔''

پڑا پتھر بھاری ہو جاتا ہے

چنانچہ میں ان کا پرچہ لیکر جلال آباد گیا اور میں نے وہ پرچہ حضرت جی (حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب قدس سرہ) کو دیا پرچہ پڑھنے کے بعد فرمانے لگے کہ پڑھو گے یا بھاگ جاؤ گے؟ میں نے کہا جی پڑھوں گا فرمایا کہ جم کے؟ میں نے کہا جی ہاں، فرمایا کہ ''ہاں پڑا پتھر بھاری ہو جاتا ہے'' اپنے زمانہ طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ صاحب نے بتایا کہ جب ہم نے حفظ شروع کیا تو غالبًا ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا ایک سال میں حفظ مکمل ہوگیا، اس کے بعد دو سال یونہی گنوا

دیئے پھر ۱۹۳۹ء میں جلال آباد میں داخلہ ہوا، اور وہاں پر دو سال میں فارسی سے لیکر شرح جامی وغیرہ تک (تا درجہ سوم عربی) چار سال کا کورس مکمل کیا۔"

جلال آباد میں حضرت جیؒ کی اولین خدمت

مجھ سے حضرت جی نے فرمایا کہ کوئی بھی کام کرنے والا نہیں ہے، تم انگیٹھی جانتے ہو؟ خرید کرلاؤ، غالباً آٹھ یا دس آنے کی انگیٹھی آئی تھی میں لے آیا، میں نے اس وقت تک کہیں سے کوئی انگیٹھی نہیں خریدی تھی، میں جوں توں کر کے لے آیا تو حضرت جی نے فرمایا تم اس کو جلانا جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، کہا کوئلے ڈالو، کوئلے ڈالے، نیچے کچھ کاغذ رکھے اس میں دیا سلائی دی ایک پنکھا میرے ہاتھ میں دیا کہ اس کو جھلو، آخر کوئلوں نے آگ پکڑ ہی لی۔ (۱)

دل کی انگیٹھی بھی گرما گئی تھی

اس انگیٹھی کا آگ پکڑنا تو خیر کوئی بہت اہم بات نہ تھی، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد حضرت علامہ صاحب کی زندگی کے حالات کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس انگیٹھی کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی انگیٹھی نے بھی آگ پکڑ لی تھی اور دل کی انگیٹھی بھی پور طرح گرما گئی تھی کیونکہ جن مشکل حالات میں رہ کر جس طرح انہوں نے جلال آباد میں تعلیم حاصل کی (جس کی کچھ تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے) یہ دل چسپی اور انتہائی لگن یونہی حاصل نہیں ہو جاتی۔ مفتاح العلوم سے انہوں نے جو مضبوط پیمان وفا باندھا اور اس کو نباہ کر دکھایا، اور حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحبؒ سے عظمت واحترام کا جو تعلق آخری سانس تک قائم رہا، حالانکہ آخر عمر میں جلال آباد سے علیحدگی کے المیہ نے اس تعلق کے نباہ کو "جام وسنداں باختن" والا نازک کام بنا دیا تھا لیکن وہ اس آزمائش میں بھی

(۱) ایضاً از کیسٹ

کھرے اترے، اس طرح کی بے شمار باتیں شہادت دیتی ہیں کہ انکے دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہی، ورنہ کسی ہوسناک سے یہ توقعات ناممکن ہیں۔

مفتاح العلوم کا پہلا طالب علم

حضرت علامہ صاحب جلال آباد میں داخل ہوئے تو مدرسہ کا بالکل ابتدائی دور تھا اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں باہر کا کوئی طالب علم دارالاقامہ میں داخل نہیں ہوا تھا، دارالاقامہ نام کی کوئی جگہ بھی وہاں نہیں تھی کیونکہ اس وقت مدرسہ اپنی ابتدائی حالت میں تھا اور جس جگہ آج مدرسہ کی شاندار عمارت کھڑی ہے وہ آبادی سے ہٹکر اور قبرستان سے ملحق ایک غیر آباد جگہ تھی، جہاں مدرسہ کے نام سے کچے پکے دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر چھت کی جگہ چھپر پڑا ہوا تھا، اور جس جگہ آج مدرسہ کے وسیع کیمپس میں عالیشان مسجد بنی ہوئی ہے یہاں پر ایک چھوٹی سی خستہ حال مسجد تھی، جس کے آس پاس خودرو درختوں کی بہتات تھی قریب ہی ویران وسنسان قبرستان تھا۔

اس طرح یہ مسجد اپنی ہیئت اور جائے وقوع کے باعث جنات کا مسکن معلوم ہوتی تھی کچھ تو مسجد و مدرسہ کا جائے وقوع اور یہ حالت و کیفیت۔ اور علامہ صاحب یہ فرماتے تھے کہ گاؤں کے لڑکوں نے بھی یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہاں تو جن رہتے ہیں اور وہ لڑکے آپس میں اس کا تذکرہ بھی کرتے رہتے تھے، مدرسہ میں جو کمرے تھے ان پر کواڑ بھی برائے نام ہی معمولی لکڑی کے لگے ہوئے تھے، کواڑوں کی لکڑی دن میں دھوپ میں تپنے کی وجہ سے رات میں ہوا سے اگر ذرا بھی ہل جاتی تو ان کواڑوں میں سے عجیب طرح کی ''چر چر'' کی آواز آتی تھی، آپ اکیلے ہی طالب علم تھے اور تنہا سوتے تھے، کیونکہ اس وقت تک دوسرا کوئی طالب علم مدرسہ میں داخل نہیں ہوا تھا ان حالات اور اس ویران جگہ پر جس کے بارے میں جنات کا مسکن ہونے کی افواہیں عام تھیں۔

ایک نو وارد تنہا طالب علم کو طبعی طور پر ہواؤں کے ہلنے کی وجہ سے کواڑوں سے نکلنے والی ''چر چر'' کی آواز بھی رات کے اندھیرے اور سناٹے میں بہت ڈراؤنی محسوس ہوتی تھی، چنانچہ علامہ صاحب نے بتایا کہ ''مجھے اندازہ تو نہیں تھا کہ یہ کواڑ چر چر کیوں کرتے ہیں میں نے چونکہ لڑکوں سے سن رکھا تھا کہ یہاں جن رہتے ہیں۔ اس لئے جب یہ آواز نکلتی تو مجھے یہ جنات ہی کی آواز معلوم ہوتی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ جن آ گئے اس طرح میں نے مدرسہ میں ایک دو رات بڑی مشکل سے گذاری اور میں نے مولانا عابد حسن صاحب (۱) سے کہا کہ حضرت رات کو تو یہاں بہت ڈر لگتا ہے یہاں تو جنات ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہم دوسری جگہ آپ کے سونے کا انتظام کئے دیتے ہیں۔''

(۱) حضرت مولانا عابد حسن صاحب عرف چھوٹے مولوی صاحب، جید عالم، مقبول و مشہور مقرر اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، مفتاح العلوم جلال آباد کے اولین مدرسین میں سے ہیں حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے دست و بازو بن کر اپنی ساری عمر مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں تعلیم و ترقی کے لئے وقف کر دی۔ شروع میں مدرسہ میں دو ہی عالم تھے، ایک حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب اور دوسرے مولانا عابد حسن صاحب۔ قصبہ جلال آباد کے لوگ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کو بڑے مولوی صاحب اور مولانا عابد حسن صاحب کو چھوٹے مولوی صاحب کہتے تھے۔ مولانا مسیح اللہ خانصاحب تو بعد میں بڑے مولوی صاحب کے بجائے حضرت جی کے لقب سے مشہور ہوئے مگر مولانا عابد حسن صاحب پر چھوٹے مولوی صاحب کا لقب کچھ ایسا چسپاں ہوا کہ اکثر لوگ ان کا نام ہی بھول گئے اور چھوٹے مولوی صاحب ہی کہنے لگے۔ چنانچہ آخر عمر تک ان کی یہی عرفیت رہی اور آج بھی مولانا عابد حسن صاحبؒ کو تو مخصوص حضرات ہی جانتے ہوں گے۔ مگر چھوٹے مولوی صاحبؒ کو پورا قصبہ جلال آباد اور پورا علاقہ اور مفتاح العلوم کا ہر قدیم و جدید فاضل جانتا ہے۔ بڑے مولوی صاحب یعنی حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب سے بھی تقریباً بیس سال پہلے ہی رحلت فرما گئے تھے۔ تغمدهما الله بغفرانه

انکے انتقال پر مفتاح العلوم میں تعزیتی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے علامہ صاحب نے کہا تھا ''کہ آج حضرت جی کا مضبوط بازو ٹوٹ گیا'' وفات کے بعد جلال آباد کی ایک مسجد میں آرام فرما ہیں اور یہ مسجد بھی چھوٹے مولوی صاحب کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

علاج مرض سے بھی بدتر

ایک ناول کے شوقین طالب علم سے واسطہ

چنانچہ مولانا عابد حسن صاحبؒ نے آپ کے سونے کا دوسری جگہ انتظام تو کر دیا لیکن یہ علاج مرض سے بھی بدتر ثابت ہوا، اس کی تفصیل علامہ صاحب نے اس طرح بتائی کہ ''جلال آباد میں راعیوں کی مسجد کے نام سے ایک مسجد ہے، اس میں ایک بہت بڑا اپل کھن کا درخت ہے وہاں ایک نومسلم لڑکا عبداللہ رہا کرتا تھا، مولانا نے مجھے وہاں اس لڑکے کے پاس چھوڑ دیا کہ یہ تمہارے کمرے میں سو جایا کرے گا، میں وہاں سونے لگا اس لڑکے کو ناول پڑھنے کا شوق تھا اس کے پاس بہت ناول رکھے رہتے تھے، وہاں رہ کر ہم بھی ناول پڑھنے لگے رات رات بھر جاگ کر ناول پڑھتے رہتے، ظاہر ہے تعلیم پر اس کا برا اثر پڑنے لگا تقریباً دو ماہ اس طرح گذر گئے پھر ہمیں احساس ہوا کہ یہ تو ٹھیک نہیں، ہم نے حضرت جی سے کہا کہ ہم وہاں اس لڑکے کے پاس چلے گئے تو یہ مصیبت کھڑی ہوگئی''۔ (منقول از کیسٹ)

غلط صحبت اور منفی ماحول خاص طور پر اس عمر میں صحیح نشو ونما اور ترقی میں جو رکاوٹ پیدا کرتے ہیں وہ ہر ذی شعور جانتا ہے بہت سے ہونہار طلباء اس طرح ضائع ہوتے ہیں کہ پھر ان کو سنبھالنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں، لیکن علامہ صاحب کو تضییع اوقات پر بروقت تنبہ ہوا، مزید سعادت یہ کہ مسیحا کے سامنے مرض کو ظاہر کر دیا اسلئے نقصان سے محفوظ رہے۔ چنانچہ آپ نے بتایا کہ میرے شکایت کرنے پر حضرت جی نے کہا کہ ہمارے یہاں چبوترے پر لیٹ جایا کرو، جہاں نیم کا درخت کھڑا ہے، گرمی کا موسم تھا میں نے کہا یہ ٹھیک ہے، یہاں کم از کم حضرت جی کے قریب ہونے کی وجہ سے کوئی وحشت تو نہیں ہوگی، میں وہاں سونے لگا اس طرح یہ شروع کا وقت گذرا۔

غرض علامہ رفیق احمد صاحبؒ مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں باہر سے داخل ہونے والے پہلے طالب علم تھے۔

مولانا سلیم اللہ خانصاحبؒ دوسرے طالب علم

آپکے تقریباً دو ڈھائی مہینہ بعد قصبہ لوہاری سے مولانا سلیم اللہ صاحب (۱) داخلے کے لئے آ گئے یہ دوسرے طالب علم تھے اس کے بعد کچھ اور طلبہ آئے اور اس طرح کل اٹھارہ طلبہ ہو گئے اکثر کتابیں حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب ہی پڑھایا کرتے تھے۔

پوری نحو میر تین دن میں پڑھی

جب علامہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی طلب اور صلاحیت دیکھی تو حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب نے درس کے عام ضوابط اور سال بہ سال کی جماعت بندی کے بجائے دو تین سال کی کتابیں تقریباً ایک ہی سال میں پوری کرا دیں چنانچہ علامہ صاحب بتاتے تھے کہ حضرت نے خارجی اوقات میں مسجد میں بیٹھ کر دو تین دن میں مجھے پوری نحو میر پڑھا دی تھی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

دو سال مفتاح العلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنے استاذ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے کہنے پر ماہ شوال ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کرالیا۔ دارالعلوم میں پانچ سال تک رہے اور اس دوران نصاب

(۱) حضرت مولانا سلیم اللہ خانصاحب قصبہ حسن پور لوہاری ضلع مظفر نگر یوپی کے رہنے والے ہیں جو پیدل کے راستہ جلال آباد سے شمال میں تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ مولانا ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان تشریف لے گئے تھے اور پاکستان کی معروف ترین علمی شخصیات میں آپ کا شمار ہے، جامعہ فاروقیہ کراچی کے بانی و مہتمم اور وفاق المدارس الاسلامیہ پاکستان کے صدر ہیں۔

تعلیم کی مروجہ کتابوں کے ساتھ تمام شروح اور فنون کی متعدد کتابیں (مثلاً شرح مقاصد، خیالی وجلالی، شرح مواقف، صدرا، شرح چغمنی وغیرہ) بھی پڑھیں۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کا حال حضرت علامہ صاحبؒ نے اسطرح بیان کیا کہ:

''ان دنوں حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب اکثر بیمار ہو جایا کرتے تھے اس سال شوال کے مہینے میں یعنی تعلیمی سال کے شروع ہی میں بیمار ہو گئے اور حضرت کو محسوس ہوا کہ شاید یہ بیماری طول پکڑ جائے گی اور میں طلباء کو ٹھیک سے پڑھا نہیں پاؤں گا اس لئے حضرت جی نے بہتر سمجھا کہ ان طلباء کے تعلیمی سلسلہ کو باقاعدگی سے جاری رکھنے کیلئے ان کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کرا دیا جائے۔

چنانچہ حضرت علامہ صاحبؒ نے بتایا کہ ''شوال کے مہینے میں ایک روز مولوی سلیم اللہ صاحب لوہاری سے میرے پاس بھیسانی آئے مجھے بھی ان دنوں بخار آرہا تھا کہنے لگے کہ مجھے حضرت جی نے بھیجا ہے اور یہ کہلوایا ہے کہ میں تو بیمار ہوں خدا جانے کب تک بیمار رہوں، پڑھا سکوں یا نہ پڑھا سکوں، آپ لوگوں کا وقت ضائع ہوگا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ دارالعلوم دیوبند چلے جاؤ۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی دیوبند دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے مولوی سلیم اللہ صاحب سے کہا کہ بھئی جب حضرت جی اچھے ہو جائیں گے جب ہی پڑھ پڑھا لیں گے ہم بھی تو بیمار ہی ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں حضرت جی نے فرمایا ہے کہ دیوبند چلے جاؤ۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ جلال آباد آ گیا اور وہاں جلال آباد سے حضرت جی نے چھوٹے مولوی صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کو دیوبند داخلہ کیلئے بھیج دیا اور ہمارا دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ہو گیا۔ (از کیسٹ)

دیوبند سے جلال آباد اور بھیسانی کے پیدل اسفار

دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے ہوئے بھی ان دونوں حضرات کا جلال آباد

حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب سے برابر تعلق رہا، حضرت علامہ صاحب اور حضرت مولانا سلیم اللہ صاحب دونوں ہر ہفتہ یا پندرہ دن میں جلال آباد آتے رہتے تھے علامہ صاحب ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتاتے تھے کہ عام طور پر ہمارے پاس کرائے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اس لئے دیوبند سے جلال آباد اور جلال آباد سے لوہاری اور لوہاری سے بھیسانی تک کا پورا سفر پیدل ہی کیا کرتے تھے۔ (جو تقریبا چالیس کلومیٹر یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہے)

ہم لوگ دیوبند سے سیدھے پہلے جلال آباد آیا کرتے تھے وہاں سے لوہاری مولوی سلیم اللہ کے گھر اور لوہاری سے پھر بھیسانی۔

ہمت وشوق کی ایک دلچسپ ونصیحت آموز کہانی

مرقات اور کنز الدقائق صرف سترہ دن میں کیسے پڑھیں

علامہ صاحب بتاتے تھے کہ ایک بار رمضان کی چھٹیوں میں ہم لوگ جلال آباد آئے تو حضرت نے فرمایا کہ اگر تم محنت کر سکتے ہو تو میں رمضان میں تم دونوں کو مرقاۃ اور کنز الدقائق پڑھا دوں گا اس طرح تم آئندہ سال شرح وقایہ کی جماعت میں شریک ہو سکتے ہو ہمیں چونکہ اگلی جماعت میں جانے کا شوق تھا (دار العلوم میں اس زمانہ میں جماعت بندی کے ضابطے اتنے سخت نہ تھے، محنتی اور قابل طلباء خالی اوقات میں کتابیں پوری کر کے اور ان کا امتحان دیکر اگلی جماعت میں شریک ہو سکتے تھے) چنانچہ ہم نے پڑھنے کا فیصلہ کر لیا، اور اس رمضان میں میرا معمول یہ رہا کہ فجر کی نماز سے پہلے ہی میں پیدل لوہاری آجایا کرتا تھا، لوہاری سے میں مولوی سلیم اللہ کو ساتھ لیتا تھا، پھر ہم دونوں جلال آباد آتے تھے۔ برسات کا موسم تھا، چریاں (گھاس) لمبے لمبے کھیتوں میں کھڑے ہوئے ہوتے تھے، شبنم میں ہمارے کپڑے بھیگ جاتے تھے، ہم لوگ حضرت جی

کے پاس آتے اور حضرت جی ہمارے آتے ہی اپنے تمام معمولات کو چھوڑ کر ہم دونوں کو پڑھانا شروع کر دیتے تھے، اور صبح کے وقت مرقاۃ اور شام میں کنز الدقائق پڑھاتے، اس طرح صرف سترہ دن میں ہم نے یہ کتابیں پوری کرلی تھیں۔اس زمانے میں رات کو میں اپنے گاؤں بھیسانی میں ہی تراویح میں قرآن شریف بھی سناتا اور اس کے لئے پارہ بھی یاد کرتا تھا، پیدل بھیسانی سے جلال آباد جانا اور پھر جلال آباد سے واپس گھر آنا تقریبًا بارہ چودہ کلومیٹر روزانہ کا پیدل سفر کرتا تھا مگر ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کوئی محنت بھی کر رہے ہیں، چھلانگ لگاتے چلے جاتے تھے، جب غروب میں دس پندرہ منٹ رہ جاتے تھے لوہاری سے میں اس وقت چلتا تھا اور افطار گھر آکر کرتا تھا۔

اہم ترین ہم درس، رفیق بھی حریف بھی

حضرت مولانا سلیم اللہ خانصاحب (مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی پاکستان) فارسی کی کتابوں اور میزان الصرف سے لیکر بخاری شریف تک حضرت علامہ صاحب کے ساتھی رہے، دونوں میں حد درجہ موانست تھی، اور یہ دونوں ہی کی بلند اقبالی کی علامت تھی کہ ہمیشہ ان کے درمیان تعلیم میں مسابقت رہتی تھی، اور دونوں میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ میں اپنے ساتھی سے آگے بڑھ جاؤں اسلئے سخت محنت اور مجاہدہ کرتے تھے اور ان کی مسابقت ایک طرح کی علمی ''سرد جنگ'' میں تبدیل ہوگئی تھی گویا یہ حضرات ایک دوسرے کے رفیق بھی تھے اور حریف بھی۔چنانچہ اس مقصد سے کہ میری محنت ظاہر نہ ہو اور میرا ساتھی مجھ سے کم محنت کرے دونوں ایک دوسرے سے اپنی رات کی محنت کو چھپایا کرتے تھے تاکہ دوسرا محنت کم کرے اور میں آگے بڑھ جاؤں۔

علامہ صاحب نے اس ضمن میں سنایا کہ ''مولانا سلیم اللہ صاحب اپنے خالو کے پاس دیوبند میں قلعہ والی مسجد میں رہتے تھے۔ایک روز میں گیا تو دیکھا کہ

مولوی سلیم اللہ یوں ہی بخار زدہ بنے پڑے ہوئے ہیں اور ایسا ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں سخت بخار ہے اور بہت بیمار ہیں۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر دیکھا تو وہ ٹھنڈا تھا، میں نے کہا کہ بھئی یہ کیسا بخار ہے؟ ہاتھ تو گرم معلوم نہیں ہوتے ایسا ٹھنڈا بخار تو ہم نے آج ہی دیکھا ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں میں بیمار ہوں۔ اعضاء شکنی ہو رہی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ چونکہ سالانہ امتحان کا وقت آ رہا ہے اس لئے مولوی سلیم اللہ صاحب یہ چاہ رہے ہیں کہ مجھے بیمار سمجھ کر یہ محنت کم کرے اور میں خوب محنت کروں اور اس طرح یہ پیچھے رہ جائیں اور میں آگے نکل جاؤں (یعنی ان کے نمبرات کم آئیں اور میرے زیادہ) چنانچہ جب ہم جاتے تھے تو وہ ہمارے سامنے بیمار بن کر لیٹے رہتے تھے، اور جب ہم ان کے پاس سے آجاتے تو وہ رات کو بڑے آرام سے کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، ہم بھی ایسا ہی کرتے تھے اور حتی الامکان اپنی محنت ان پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہمارے درمیان یہ مسابقت کا سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔

آم کے درختوں پر مطالعہ و مذاکرہ

ایسا بھی ہوا کہ مولوی سلیم اللہ نے ہم سے چھپ کر مدرسہ اور اپنے کمرے کے بجائے جنگل میں جا کر کتاب دیکھنا اور تکرار کرنا شروع کیا۔ تاکہ ہمیں پتہ نہ چلے اور ہم یہ سمجھیں کہ ایسے ہی گھومنے گئے ہوں گے۔ لیکن ہمیں بھی سراغ مل ہی گیا کہ یہ جنگل میں جا کر مطالعہ اور تکرار کرتے ہیں، اس زمانہ میں عیدگاہ کی طرف حضرت مہتمم صاحب (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) کا ایک باغ تھا۔

میں بھی اپنے ایک ساتھی مولانا حمید اللہ صاحب (ماجری والے) کو لیکر اس باغ میں چلا جاتا تھا، ہم دونوں آم کے پیڑ پر چڑھ جاتے اور درخت کے اوپر ہی میبذی کا تکرار کرتے تھے اس طرح ہم نے پوری کتاب (میبذی) کا آم کی

ٹہنیوں پر بیٹھ کر تکرار کیا۔

پندرہ راتیں مسلسل جاگ کر گذاریں

حضرت علامہ صاحبؒ نے سال ہفتم میں اپنے تعلیمی شوق اور مسابقت کے جذبہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ سال ہفتم کے سالانہ امتحان کے موقعہ پر مسلسل پندرہ راتیں ایسی گذریں جن میں ہم ایک منٹ کے لئے بھی نہیں سوئے، کیونکہ امتحان کے موقعہ پر ہم نے یہ اہتمام کیا تھا کہ کوئی کتاب ایسی نہ ہو جس کو ہم امتحان کی رات میں اول سے آخر تک نہ دیکھ لیں، چنانچہ ہم عشاء کے بعد سے فجر کی اذان تک پوری کتاب دیکھ لیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مشکوٰۃ وجلالین جیسی کتابیں ایک رات میں دیکھنا مشکل ہے۔

لیکن ہمارا مطالعہ کا خاص انداز تھا کہ کتاب کا ورق پلٹتے گئے اور جو مسئلہ ذرا اہم اور خاص الجھن کا ہوا اس کو غور سے دیکھ لیا، کہیں حاشیہ دیکھ لیا، کہیں بین السطور دیکھ لی۔ ہمارے پاس استادوں کے لکھے ہوئے نوٹ بھی ہوتے تھے، جو ہم درس کے وقت لکھ لیتے تھے، ساتھ ساتھ وہ نوٹ بھی دیکھتے جاتے تھے۔ اسی طرح پوری رات میں ایک کتاب کا مطالعہ کرلیا کرتے تھے، فجر کی اذان ہوئی اور ہم نے کتاب بند کی، اذان کے بعد سنتیں پڑھی اور لیٹ گئے نماز کے وقت تک ہم سوتے تھے، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رات بھر جاگنے کے باعث اور اس وقت سونے کی وجہ سے کبھی ہماری فجر کی نماز قضا ہوئی ہو۔ بلکہ الحمدللہ اس وقت سے ہی نماز کے لئے ایسی عادت پڑگئی کہ فجر کی نماز کے لئے جگانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ الاماشاءاللہ جب تکان زیادہ ہوتی ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں ہمیں ناشتہ کی بھی عادت نہیں تھی اتفاق سے ہوگیا ہوگیا، نہ ہوا نہ سہی، اس لئے ناشتہ وغیرہ تیار کرنے کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بہر حال فجر کی

نماز کے بعد امتحان کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہم دوبارہ ان مقامات کو پھر خاص طور سے دیکھتے تھے جن کی امتحان میں آنے کی غالب توقع ہوتی تھی، غرض یہ پندرہ راتیں ایسی گذریں جن میں پوری رات مطالعہ کیا، اور چونکہ میں یہ کام چوری سے تنہا ہی الگ بیٹھ کر کرتا تھا اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ میرا ساتھی بھی ایسا ہی کرتا تھا یا نہیں کیونکہ ہم اپنی اس طرح کی چوری ایک دوسرے کو بتاتے نہیں تھے۔

مفتاح العلوم جلال آباد میں ضمنی تدریس

اس مشق سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی اس طرح جاری تھی کہ جلال آباد میں اس وقت چونکہ مدرسین کی کمی تھی اور تقریباً ساری کتابیں حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کو ہی پڑھانی ہوتی تھی اس لئے کبھی کبھی کتابوں کی تکمیل میں تعاون کے لئے دیوبند سے علامہ صاحب کو بلالیا کرتے تھے اور وہ اپنے اسباق چھوڑ کر دارالعلوم سے چھٹی لیکر جلال آباد حاضر ہوجاتے تھے۔

چنانچہ علامہ صاحبؒ نے بتایا کہ ''جس سال ہمارا دارالعلوم میں دورۂ حدیث شریف تھا اس سال حضرت جی کی طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوگئی، حضرت کو یہ خیال ہوا کہ میں اپنی کتابیں پوری نہ کراسکوں گا اس لئے مجھ سے فرمایا کہ یہ کتابیں پوری کرادیں۔ شرح جامی وغیرہ جو حضرت جی پڑھا رہے تھے، میں ان کتابوں کو ایک ماہ میں پوری کراکے پھر دارالعلوم جاکر اسباق میں شریک ہوگیا۔ میں حضرت جی کے فرمانے پر دارالعلوم سے چھٹی لیکر آیا تھا اور مجھے یہ خیال تھا کہ شاید اس بار میں مولوی سلیم اللہ صاحب سے پیچھے رہ جاؤں گا کیونکہ میرا ایک مہینہ چلا گیا۔ لیکن الحمدللہ میں کسی کتاب میں بھی پیچھے نہیں رہا اور کسی بھی کتاب میں ایک آدھ نمبر بھی ضائع نہیں ہوا۔''

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی زیارت اور بچپن کے بعض واقعات

قصبہ تھانہ بھون بھیسانی گاؤں سے چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور موضع بھیسانی کے لوگ حضرت تھانویؒ سے بہت عقیدت ومحبت رکھتے تھے اسلئے خاص طور پر جمعہ کی مجلس میں بہت سے لوگ بھیسانی سے خانقاہ تھانہ بھون میں حاضر ہوا کرتے، اس وقت علامہ رفیق احمد صاحب گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ بچپن میں اہل اللہ سے محبت اور تعلق آگے چل کر اپنا اچھا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ اس اعتبار سے گویا کم سنی میں ہی آپ کی زندگی کا رخ صحیح سمت میں ہوگیا تھا۔ چنانچہ حضرت علامہ صاحب نے بچپن کی یادوں کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ:

"جس زمانے میں ہم گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ ہر جمعہ کو گھر کے کسی نہ کسی فرد کے ساتھ خانقاہ آیا کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کے گھر سے خانقاہ تشریف لاتے یا لیجاتے ہوئے ہم لوگ مصافحہ کرلیا کرتے تھے۔ راستہ میں اس وقت مصافحہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ گرمی کے موسم میں جب چلتے تو ان کے ایک ہاتھ میں چھتری رہا کرتی جو کھلی ہوئی کندھے پر رکھی رہتی تھی۔ اور ایک ہاتھ میں لکڑی کی بید رکھتے، اسی ہاتھ میں تسبیح بھی ہوا کرتی تھی"۔

گاؤں کے پرائمری اسکول کے بعد چونکہ علامہ صاحب مدرسہ خانقاہ تھانہ بھون میں ہی حفظ قرآن کے لئے داخل ہوگئے تھے اس لئے بچہ ہونے کے وجہ سے گھر میں آنا جانا تھا اور گھر کی چھوٹی موٹی خدمات کرتے رہتے تھے۔ کبھی گھر سے خانقاہ میں کھانا لے گئے کبھی گھر سے دوا پہنچانی ہوتی تو وہ لیجاتے۔ انھیں دنوں کا ایک واقعہ علامہ صاحب نے سنایا کہ:

"ایک دفعہ آپا صاحبہ نے حضرت کی دوا دیکر مجھے خانقاہ میں حضرت کے

پاس بھیجا۔ دوا کٹوری میں تھی اور دوا کی اس کٹوری پر ایک ڈھکن ہوتا تھا، جس میں پان رکھا ہوتا تھا۔ اور پان میں کتھا چونا وغیرہ کچھ نہیں صرف سپاری (چھالی) کے دانے رکھے ہوتے تھے۔ دوا کھانے کے بعد حضرت وہ پان نوش فرماتے تھے۔ اس پان کو لیجاتے ہوئے راستے میں انگلی سے دبائے رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ کہ ہوا سے اڑنے نہ پائے انگلی اگر ذرا سی ڈھکن سے ہٹ جاتی یا ڈھیلی پڑ جاتی تو وہ پان اڑ جاتا تھا۔

ایک روز ایسا ہی قصہ ہوا کہ راستہ میں چلتے ہوئے ہماری انگلی ذرا سی ہٹ گئی، اور وہ پان اڑ کر نیچے گر گیا۔ ہم بہت گھبرائے کہ حضرت کو تو اس کا علم ہو جائے گا۔ لیکن پھر بھی ہم نے اس پان کو اٹھایا اور لے جا کر مسجد میں خوب اچھی طرح دھویا۔ چونکہ چونا وغیرہ تو اس پر تھا نہیں اس لئے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

شیخ چلی کا تعویذ

ایک مرتبہ گاؤں سے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ حضرت سے شیخ چلّی کا تعویذ لا کر دینا۔ میں نے خانقاہ میں اپنے استاذ خلیفہ جی سے کہا کہ شیخ چلی کا تعویذ چاہئے حضرت سے کس طرح لیا جائے گا۔ تو خلیفہ جی نے کہا کہ تم حضرت کے پاس جاؤ اور سامنے بیٹھ جانا اور بیٹھ کر یوں کہنا کہ حضرت! ایک تعویذ چاہئے شیخ چلی کا۔ اور اس کے استعمال کی ترکیب میں نے خلیفہ جی سے معلوم کر لی ہے۔ چنانچہ میں گیا اور ایسے ہی کہا کہ ایک تعویذ چاہئے شیخ چلی کا اور میں نے اس کے استعمال کی ترکیب خلیفہ جی سے معلوم کر لی ہے۔ تو حضرت بہت خوش ہوئے اور مجلس میں بیٹھے ہوئے حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ دیکھئے یہ بچہ ہے! اور اس نے کتنی صاف اور جامع بات کہی ہے۔ اب میں اس کو تعویذ نہ دوں تو کیوں نہ دوں؟ لوگ مجھے دق کرتے ہیں، کہتے ہیں تعویذ دیدو، یہ نہیں بتاتی کہ تعویذ کس چیز کا؟ بخار کا؟

درد کا؟ گویا ان کی ضرورت کا مجھے پہلے سے علم ہے۔ اور پھر میں پوچھوں تو مجھ پہ سختی کا الزام رکھتے ہیں۔ آدمی کو صاف اور سیدھی سچی بات کرنی چاہئے''۔

جلال آباد مدرسہ میں داخلہ کے بعد بھی تھانہ بھون حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب چونکہ ہر جمعہ کو باقاعدگی سے تھانہ بھون آیا کرتے تھے۔ تو ہر جمعہ کو وہاں سے بھی علامہ صاحب حضرت کے ساتھ خانقاہ میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ سفر ہمیشہ پیدل ہی ہوا کرتے تھے۔ صبح کو تھانہ بھون جاتے، اور شام کو جلال آباد لوٹ کر آجاتے۔ علامہ صاحب بتایا کرتے تھے کہ:

''یہ تو اب یاد نہیں کہ ان مجلسوں میں حضرت تھانویؒ کیا کیا فرماتے تھے، بس اتنا یاد ہے کہ مجلس بہت شاداب ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ایک دو دو گھنٹے کی مجلس بالکل خاموشی کے ساتھ گذر جاتی تھی۔ حضرت تھانویؒ برابر اپنی تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ اسی دوران لکھتے ہوئے کوئی بات حاضرین کو سنانی ہوتی تو وہ آہستہ سے ہوتی تھی کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے نہیں سن پاتے تھے۔ لیکن اس خاموشی کے باوجود مجلس میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ نہ کوئی آدمی اٹھ کر جاتا تھا نہ کسی کو اکتاہٹ محسوس ہوتی۔ لوگ باہر تک بیٹھے رہتے تھے اور سب لوگ آخر تک اطمینان سے بیٹھے رہتے''۔

دارالعلوم دیوبند میں ایک جن طالب علم کے یہاں چائے کی دعوت

حضرت علامہ صاحب سے جو سوالات کئے تھے اور جن کے جوابات علامہ صاحب کی زبانی کیسٹ میں محفوظ ہیں اسی ضمن میں یہ عجیب سا سوال بھی کیا گیا کہ دارالعلوم دیوبند میں کیا آپ کے ساتھ جنات بھی پڑھتے تھے۔ تو علامہ

صاحب نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور پھر پرانی یادوں کو دہراتے ہوئے آپ نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ہم اس کیسٹ سے علامہ صاحب کے الفاظ میں ہی اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں چنانچہ آپ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں! اس کا نام ''امیر باز خاں'' تھا وہ سبق میں میرے پاس ہی بیٹھا کرتے تھے اور کبھی کچھ پوچھتے بھی نہیں تھے خاموش رہتے تھے، کتاب دیکھتے تھے اور کبھی کبھی وہ ہماری تکرار (مذاکرہ) میں بھی آتے تھے اس تکرار میں ذرا بے تکلفی سی ہوئی تو میں نے کہا ''امیر باز خاں'' تم کبھی چائے تک نہیں پلاتے اس نے کہا اچھا! آج پلائیں گے، کمرے میں چلو ہمارے، باب الظاہر (۱) میں اس کا کمرہ تھا تو ایک روز ہم اس کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے میں گئے، اس نے کہا آپ تھوڑی دیر کمرے کے باہر کھڑے ہو جائیں میں ذرا اسے ٹھیک کر لیتا ہوں۔

کہا ٹھیک ہے، اس نے اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا ہم باہر کھڑے رہے، بہت دیر ہوگئی دروازہ ہی نہیں کھولتا۔ ہم آپس میں کہنے لگے کہ اتنی دیر ہوگئی یہ تو دروازہ ہی نہیں کھولتا، یہاں لاکر کھڑے کر دیئے نہ اندر بلاتا ہے، نہ یہ کہتا ہے کہ چلے جاؤ۔ کیا ماجرا ہے؟ اندر جا کر سو گیا یا مر گیا؟ اس کے کمرے میں ایک چھوٹا سا روشن دان سا لگا ہوا تھا اوپر دروازہ کی چوکھٹ پر جو ہوا دان سا لگا ہوا ہوتا ہے۔ جب بہت دیر ہوگئی ہم نے اس روشن دان سے جھانک کر دیکھا کہ آخر یہ اندر کر کیا رہا ہے؟ لیکن دیکھا تو اندر تو کچھ بھی نہیں کمرہ بالکل خالی تھا امیر باز خاں اندر موجود نہیں تھا ہم بہت حیران ہوئے کہ وہ کہاں چلا گیا؟ اور کیسے چلا گیا؟ دروازہ تو بند ہے، اور باہر ہم کھڑے ہوئے ہیں، ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ

(۱) دار العلوم دیوبند کا مغربی دروازہ جس کے اوپر اور اطراف میں متعدد رہائشی کمرے بھی بنے ہوئے ہیں یہ دروازہ افغانستان کے سابق شاہ ''ظاہر شاہ'' کے مالی تعاون سے تعمیر ہوا تھا اسی مناسبت سے اس کا نام باب الظاہر ہے۔

اس نے اندر سے کنڈا کھول کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی برتن میں دودھ رکھا ہوا تھا، اس نے کہا کہ اندر آجاؤ، اب چائے بناؤں گا، ہم نے کہا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ تم تھے کہاں؟ کنڈا لگا رکھا تھا اور تم اندر موجود نہیں تھے، تو اس نے کہا نہیں میں یہیں تھا، ہم نے کہا نہیں ہم نے اچھی طرح مشاہدہ کرلیا ہے۔ آپ سبھی کے مشاہدہ کو کیسے جھٹلا دیں گے۔

جب اس نے دیکھا کہ اس کو سچائی بتانی ہی پڑے گی، تو پھر اس نے بتلایا کہ اجی میں جن ہوں، دودھ لینے گیا تھا، آپ کسی سے میرا ذکر نہ کریں۔ وہ جن پشاور کے رہنے والے تھے ہم نے ان سے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کی حالانکہ ہم ساتھ پڑھتے تھے لیکن بعد میں پھر اس نے ملنا جلنا کچھ کم کردیا تھا ویسے ملتے تھے، آتے تھے مگر جان چھڑانے کی کوشش کرتے تھے۔(۱)

دارالعلوم دیوبند سے فراغت اور بھیسانی میں تدریس کے فرائض

دارالعلوم میں آپ کے اہم اساتذہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ اور حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ (مولانا عبدالاحد صاحبؒ کے والد) تھے۔ بہرحال بڑی نیک نامی اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوکر ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں حضرت علامہ رفیق احمد صاحب دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے گاؤں بھیسانی کے مدرسہ مصباح العلوم میں بیٹھ کر بچوں کو نورانی قاعدہ پڑھانا شروع کردیا، لیکن فوراً ہی مفتاح العلوم جلال آباد (جہاں سے علامہ صاحب کو ایک فطری انسیت اور محبت و تعلق تھا) کی کشش

(۱) علامہ صاحب کی ریکارڈ شدہ گفتگو سے اقتباس۔

نے اپنا اثر دکھایا اور حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کو آپ پر جو اعتماد و افتخار تھا اس کے پیش نظر تیرہ روز بعد ہی آپ کو بھیسانی سے جلال آباد بلالیا گیا اور وہاں آپ نے مختصر المعانی شرح جامی اور مقامات حریری وغیرہ کتابیں پڑھائیں۔

اس زمانہ میں وہاں مولانا محمد یاسین صاحب (۱) اور ان کی جماعت زیر تعلیم تھی، مفتاح العلوم میں دو سال پڑھانے کے بعد حالات میں کچھ تبدیلی آئی اور علامہ صاحب پھر مدرسہ مصباح العلوم بھیسانی تشریف لے گئے، مدرسہ بھیسانی میں آپ نے نورانی قاعدہ سے لیکر درجہ سوم عربی تک تعلیم جمائی، اس دوران آپ کے اہم ساتھی حضرت مولانا سلیم اللہ خانصاحب مفتاح العلوم جلال آباد میں تعلیم پڑھاتے رہے۔

مفتاح العلوم جلال آباد میں تقرر

علامہ صاحب کو بھیسانی ہی میں پڑھاتے ہوئے سات سال ہو چکے تھے کہ مولانا سلیم اللہ خانصاحب پاکستان چلے گئے۔ غالباً علامہ صاحب نے اپنے گاؤں بھیسانی کو ہی اپنی مستقل محنت کا مرکز بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن آپ کی ذات سے علم حدیث کے جس فیضان عام کا فیصلہ مشیت الٰہی کر چکی تھی اس کے باعث قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے مستقل اصرار پر آپ دوبارہ جلال آباد تشریف لے گئے اور پھر اپنی ساری محنت، صلاحیت، توجہ و قابلیت مستقل طور پر مفتاح العلوم جلال آباد کی نذر کردی، اب مفتاح العلوم ہی آپ کی تمناؤں کا مرکز اور امنگوں کا مسکن تھا۔ محنت کی عادت تو پہلے ہی سے تھی۔ علامہ صاحب کی قدرتی صلاحیت اور خداداد قابلیت کو مفتاح العلوم کی وسیع فضا مہیا ہوئی تو ان کی شہرت و مقبولیت پورے علاقے میں گویا پر لگا کر اڑنے لگی۔

(۱) موجودہ شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد۔

بخاری شریف وترمذی شریف کا درس

آپ کے دوبارہ جلال آباد آنے کے اگلے سال وہاں دورۂ حدیث شریف کا آغاز ہوا، حضرت مفتی سعید احمد صاحب لکھنویؒ کو بحیثیت شیخ الحدیث بلایا گیا۔(۱) لیکن مفتی صاحب ایک ہی سال پڑھا پائے تھے کہ اگلے سال ہی ششماہی امتحان کے قریب ان کا انتقال ہوگیا۔

اگرچہ اس دوران بھی علامہ صاحب بخاری شریف جلد ثانی اور ترمذی شریف کا کچھ حصہ پڑھاتے رہے تاہم مفتی سعید احمد صاحب کے انتقال کے بعد تو مستقل طور پر بخاری شریف اور ترمذی شریف علامہ صاحب کے پاس ہی آ گئیں۔اور حضرت علامہ مسند حدیث کے لئے کچھ ایسے موزوں ثابت ہوئے گویا قدرت نے ان کو اسی مسند کے لئے تیار کیا تھا حدیث نبویؐ سے عشق، علم حدیث پر ان کا عبور، وسیع مطالعہ، ان کی خداداد ذہانت واستحضار اور سونے پر سہاگہ ان کی

(۱) حضرت مفتی سعید احمد صاحب، حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنویؒ (صاحب خلاصۃ التفاسیر) کے فرزند تھے حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے اور حضرت مولانا تھانویؒ کے مجاز صحبت تھے حضرت تھانویؒ کو مفتی صاحب کے علم وتفقہ پر بڑا اعتماد تھا چنانچہ جب حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ دار العلوم دیوبند سے ڈابھیل تشریف لے گئے تو حضرت تھانویؒ نے دار العلوم کے شیخ الحدیث کے لئے بھی مفتی صاحب کا نام تجویز فرمایا تھا مفتی صاحب عربی بھی بڑی عمدہ بولتے تھے مفتی صاحب نے مفتاح العلوم میں ہی وصال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے، حضرت مفتی سعید احمد صاحب حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے استاذ بھی تھے استاذ وشاگرد میں بڑا والہانہ اور عقیدتمندانہ تعلق تھا چنانچہ مفتی صاحب حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد اپنے شاگرد حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحبؒ سے بیعت ہوئے اور حضرت نے اپنے استاذ کو اجازت بھی دی مفتی صاحب نے ہی آپ کو مسیح الامت کا لقب دیا تھا ادھر شاگرد کی محبت وعقیدت کا یہ حال تھا کہ جب مفتاح العلوم میں مفتی صاحب بخاری شریف کا درس دیتے تو حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب بسا اوقات انکے درس میں شامل ہوکر استفادہ کرتے اور آخر عمر تک بڑے اہتمام بلکہ افتخار کے ساتھ استاذ محترم کا تذکرہ فرماتے اور آخر کار اپنی تدفین کے لئے بھی مفتی صاحب کی قبر کے برابر میں ہی جگہ کا انتخاب فرمایا۔ چنانچہ دونوں اعلیٰ مقام استاذ وشاگرد اور پیر ومرید مدرسہ کے عقبی قبرستان میں برابر برابر آرام فرما ہیں۔ محبت ووفا اور ایثار واخلاص کی یہ زندہ جاوید کہانی مفتاح العلوم کا سرمایہ افتخار ہے۔

شگفتہ بیانی، سادہ صاف زبان، دلچسپ طرز استدلال، دل موہ لینے والا انداز خطاب، ہر ادا میں سادگی اور وقار، ان سب صفات نے ان کی شخصیت کو بہت پرکشش بنادیا تھا۔ شروع کے سالوں میں بخاری شریف کتاب الایمان تک حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحبؒ پڑھاتے تھے لیکن بعد میں حضرت کے خانقاہی امور میں زیادہ مصروفیت کے باعث وہ حصہ بھی علامہ صاحب ہی پڑھاتے تھے اور کچھ اس انداز اور اس ذوق سے پڑھاتے تھے کہ طلباء ان کے درس کے گرویدہ اور مشتاق رہتے تھے۔

علامہ صاحبؒ چونکہ بہت سے مدارس کی سرپرستی بھی فرماتے تھے ان کے امتحان واجلاس میں شرکت کیلئے اسفار بھی ناگزیر تھے اس لئے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ علامہ صاحب مغرب یا عشاء کے بعد مدرسہ میں تشریف لاتے اور فوراً ہی درس شروع ہو جاتا۔ فجر کے فوراً بعد ہو یا عشاء کے دیر بعد تک طلباء ان کے درس میں شوق و مسرت سے شامل ہوتے تھے۔

درس ترمذی شریف کا خاص اہتمام

بخاری شریف کے ساتھ ہی ترمذی شریف کو وہ خاص اہتمام سے پڑھاتے تھے مسائل کا خلاصہ اور فقہاء کے نقطہائے نظر کو بڑے سلیس اور دلکش انداز میں بیان فرماتے۔ جب علامہ صاحب ترمذی شریف پڑھانے کیلئے اپنے کمرہ سے دار الحدیث میں آنے کے لئے کتاب دائیں ہاتھ سے پکڑ کر ادب کے ساتھ سینے سے لگائے کمرے سے برآمد ہوتے تو میں کھڑے ہو کر ان کو دیکھتا، مجھے ان کا یہ انداز بہت پسند تھا۔ کتاب لیکر درسگاہ میں آنے کی یہ خصوصیت ترمذی شریف کے ساتھ ہی تھی۔ (۱) چشم فلک نے بڑے بڑے محدثین وفقہاء کو دیکھا ہے اور

(۱) ترمذی شریف کا یہ نسخہ علامہ صاحبؒ کو انکے استاذ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور سے عنایت فرمایا تھا۔

تاریخ نے ان کی مبارک یادوں کے عظیم سرمایہ کو ایک مقدس امانت کے طور پر اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اللہ کی ہزاروں لاکھوں رحمتیں ہوں امت کے ان سپوتوں پر جنہوں نے اپنی زندگیاں حدیث وقرآن کی تعلیم وترویج میں صرف کردیں اور دنیا کیلئے علم وعمل اور عشق ومحبت کی ایک لازوال سدابہار قیمتی متاع چھوڑ گئے اور قابل فخر سنہری تاریخ رقم کرگئے۔

میں جب علامہ صاحبؒ کو اس طرح ترمذی شریف سینے سے لگائے دارالحدیث کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا تو مجھے محدثین کی وہ پاکباز جماعت یاد آتی جن کے نفوس قدسیہ کی بدولت ہی آج ہم اس عظیم میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث اور خوشہ چیں ہیں یہ بالواسطہ طور پر ان اکابر کی محنت اور سوز وگداز کا ہی تو اثر ہوگا جس نے گاؤں کے ایک کھلنڈرے نوجوان کو محنت و محبت کی بھٹی میں تپا کر ایک باوقار شیخ الحدیث بنادیا۔

ماضی کا ایک دلچسپ منظر

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور میری آنکھوں کے سامنے تیئس چوبیس سال پہلے کا وہ منظر گردش کررہا ہے کہ طلباء مفتاح العلوم کے دارالحدیث میں جمع ہیں اور علامہ صاحب تنہا اپنے کمرہ سے نکلتے ہیں، سفید کرتا پائجامہ، سر پہ دوپلی ٹوپی، گدّی کو چھوتے ہوئے گھنگھریالے خوبصورت بال، کچھ سنورے ہوئے کچھ بکھرے ہوئے، پیروں میں جے پوری جوتیاں، وقار واحترام سے قدم اٹھاتے ہوئے دارالحدیث کی طرف بڑھ رہے ہیں، ترمذی شریف دائیں ہاتھ سے سینے سے اس طرح لگائی ہوئی ہے گویا ان کی یہ عمر بھر کی کمائی ہے جسے وہ اپنے شاگردوں کو پیش کرنے جارہے ہیں اور میں لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ یقیناً وہ بڑی نیک ساعت ہوگی جب علامہ صاحب پہلی بار مسند حدیث پر فائز ہوئے کہ

انہوں نے اس مبارک مسند کے وقار ومعیار کو پوری طرح محفوظ رکھا اور اپنی زندگی درسِ حدیث کے لئے وقف کردی، حقیقت میں علامہ صاحب کی قابلیت اور قوت بیانی ان عظیم الشان کتابوں اور اس قابلِ احترام مسند کے شایان شان تھی۔

حضرت علامہ صاحب کا ایک یادگار درس بخاری

وہ مفتاح العلوم میں بخاری شریف وترمذی شریف کا درس دیتے تھے اور حقیقت میں وہ ایسے مایۂ ناز اور قابل افتخار استاذ تھے جن سے مسند درس رونق پاتی ہے اور اس کا معیار بلند ہوتا ہے۔ انہوں نے جلال آباد میں تقریباً پچیس سال تک بخاری شریف کا درس دیا لیکن ختم بخاری اور آخری حدیث کا درس ہمیشہ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب ہی دیا کرتے تھے (اور جس نے آخری سالوں میں زبردست مقبولیت حاصل کرلی تھی) حضرت کی یہ تقریر کتابی شکل میں بھی عرصہ پہلے شائع ہوچکی تھی۔

۱۹۷۷ء میں حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب طویل سفر پر تھے (غالباً انگلینڈ کا سفر تھا) اس لئے ختم بخاری شریف پر تقریر کرنا حضرت کے لئے ممکن نہ تھا اور حضرت علامہ رفیق صاحب کیلئے جلال آباد کی طویل تدریسی مدت میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب یہ خوشگوار اور مبارک عمل لیکن ساتھ ہی دشوار ونازک ذمہ داری خود علامہ صاحب کو پوری کرنی پڑی، علماء واساتذہ سالہا سال سے حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے درس کے عادی تھے، جو اپنے مخصوص انداز میں بزم علم واحسان سجاتے تھے۔ اس درس میں مفتاح العلوم کے تمام اساتذہ کے علاوہ علاقے کے بہت سے خواص وعوام شریک ہوتے تھے۔

بہر حال حضرت علامہ صاحبؒ کا آخری حدیث کا درس اور ختم بخاری شریف پر تقریر کرنا مفتاح العلوم کے اس وقت کے حالات میں ایک اعزاز بھی تھا

اور سخت آزمائش بھی، اس باوقار مجلس اور اس معیار کو قائم رکھنا آسان کام نہ تھا۔ جو مدت سے حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب نے قائم کیا ہوا تھا، بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ علامہ صاحب حضرت والا کی (مطبوعہ) تقریر کے کچھ حوالے اور اقتباسات ہی اپنے انداز میں پیش کریں گے، اس وقت میں سال ہفتم کا طالب علم تھا اور الحمدللہ علمی زبان اور علمی اصطلاحات سے کچھ مانوس ہو چکا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بعض اساتذہ محض رسماً بلکہ امتحاناً آ گئے تھے، لیکن جب مجلس سے اٹھ کر گئے تو وہ علامہ صاحب کے وسعتِ مطالعہ، استحضار اور علمی تفوق کے قائل ہو کر گئے، اور مجھے یاد ہے کہ اس تقریر کا علمی مجلسوں میں کئی دن تک چرچا رہا، علامہ صاحب نے ڈھائی گھنٹے تک ایسی پرمغز، جامع، دلچسپ اور مدلل تقریر فرمائی کہ یہ مجلس ایک علمی یادگار بن گئی اور وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا اساتذہ طلباء اور مہمان برابر مستفید ہوئے۔

ایک علمی نکتہ

علامہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علم دراصل انسان کے اندر سے نکلتا ہے، اور کتابوں سے اس کے اندر جو علم جاتا ہے یا پہونچایا جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے نل (ہینڈ پمپ) لگاتے وقت اس کے اندر سے پانی نکالنے کے لئے پہلے اوپر سے چند بالٹی پانی ڈالتے ہیں اور پھر نل چلاتے ہیں، تو اندر سے پانی نکلنا شروع ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے نل کے اندر سے صرف وہی پانی باہر نہیں آتا جو اس میں بالٹی کے ذریعہ باہر سے ڈالا گیا۔ بلکہ اس کے ساتھ اس سے ہزار گنا پانی خود نل کے اندر سے نکلتا ہے اسی طرح کتابوں کے ذریعہ انسان کے اندر جو علم ڈالا جاتا ہے تو اس سے تحریک پا کر یا اس کے ذریعہ جب انسان کے اندر سے علم کے سوتے پھوٹتے ہیں تو صرف وہی علم باہر نہیں آتا جو اس نے پڑھا ہے بلکہ اس کے

طفیل اور ذریعہ سے ہزاروں گنا زیادہ علم انسان کے اندر سے نکلتا ہے۔ البتہ نلوں سے پانی نکلنے کی مقدار میں تفاوت ضرور ہوتا ہے۔

میں حضرت علامہ صاحب کے اس بیان کی ذرا وضاحت کردوں کہ جیسے نل سے زیادہ یا کم پانی کے نکلنے کی وجوہات زمین میں اس کی گہرائی اور پانی کے سوتوں سے اس کے ربط اور زمین کی (علاقہ کے اعتبار سے) قدرتی صلاحیت پر موقوف ہے نیز پانی تلخ وشیریں، سودمند اور مضر ہر طرح کا ہوتا ہے۔ تقریباً یہی حال علم کا ہے کہ اس کی کثرت وقلت اور منفعت ومقبولیت آدمی کی محنت وتوفیق اور انسان کی فطری وقدرتی صلاحیت اور اہل علم وعمل سے اس کے روابط پر موقوف ہے بہر حال مجھے علامہ صاحب کے اس مقولہ کی اولین تصدیق خود ان کی اس ''تقریر ختم بخاری شریف'' سے ہوئی وہ ہمیشہ کی طرح موضوع پر مکمل طور پر حاوی تھے اور انہوں نے اس طویل تقریر میں نہ تو رسمی جملے دہرائے اور نہ کسی کے الفاظ مستعار لئے، کاش وہ تقریر طبع ہو کر شائع ہوجاتی تو اہل علم کے لئے بڑے فائدے کی چیز ہوتی۔

پڑھی ہوئی تمام کتابیں پڑھائیں

ایک دفعہ علامہ صاحب نے بتایا کہ طالب علمی کے دوران میری تمنا تھی اور میں یہ دعاء کیا کرتا تھا کہ یا اللہ میں جو کتابیں بھی پڑھ رہا ہوں وہ سب کتابیں پڑھانے کی توفیق مل جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ جتنی کتابیں پڑھی تھیں میزان سے بخاری شریف تک سبھی کتابیں خوب جی بھر کے پڑھا چکا ہوں۔

ایک اہم نصیحت

علامہ صاحب کو مفتاح العلوم سے بہت محبت تھی اور وہاں کے ہر طالب علم کو وہ اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے، میں ششم وہفتم عربی (جلالین شریف و

مشکوٰۃ شریف) یعنی دو سال تک مفتاح العلوم میں پڑھا۔ علامہ صاحب صرف بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھاتے تھے اور میں دورۂ حدیث شریف کے سال دارالعلوم دیوبند چلا گیا تھا اس لئے حضرت علامہ صاحب سے استفادہ کرنے اور باقاعدہ کوئی کتاب پڑھنے کا شرف تو مجھے حاصل نہیں ہو سکا لیکن بہر حال ان کے مبارک زمانے میں مدرسہ مفتاح العلوم میں دو سال زیر تعلیم رہا اور اس دوران ذرا قریب سے ان کے حالات وخیالات کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا اور اندازہ ہوا کہ طلباء سے ان کو بہت انسیت ہے اور کوئی مدرسہ مفتاح العلوم کو چھوڑ کر کسی اور مدرسہ میں داخل ہو جائے تو ان کو دکھ ہوتا ہے۔

چنانچہ میں نے جب بعض ذاتی وجوہ کے باعث دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کرالیا اور اس کے کچھ دنوں بعد چھٹیوں میں دارالعلوم سے جلال آباد ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو علامہ صاحب نے افسردگی کے ساتھ فرمایا تم دیوبند کیوں چلے گئے؟ میں نے وجہ بتائی تو فرمانے لگے، کہ جب کوئی مفتاح العلوم سے فارغ ہوتا ہے تو ہمیں یہ خوشی ہوتی ہے کہ ایک بیٹا اور ہو گیا۔ اور کوئی دارالعلوم سے فارغ ہوتا ہے تو خوشی ہوتی ہے کہ ایک بھائی کا اضافہ ہو گیا۔ خوشی دونوں صورتوں میں ہوتی ہے، اس کے بعد ذرا سنجیدہ ہو کر فرمایا، وہاں کسی سے دوستی نہ کر لینا، پھر ذرا توقف کر کے فرمایا اور نہ دشمنی۔

طلباء کے مدرسہ سے اخراج پر حضرت علامہ صاحب کی رائے

حضرت علامہ صاحب طلباء کے ساتھ حتی الامکان شفقت کا برتاؤ کرتے اور اسی کا مشورہ سب کو دیا کرتے تھے۔ اور مدرسہ سے طالب علم کے اخراج کے تو بہت مخالف تھے۔ اور اس سلسلہ میں اپنی الگ مستقل رائے رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے زمانہ میں مفتاح العلوم ہی میں متعدد بار طلباء کے اخراج کے واقعات

پیش آئے لیکن وہ ہر موقع پر مناسب احتجاج اور ناپسندیدگی کا اظہار ضرور فرماتے تھے۔ البتہ یہ ان کی حقیقت پسندی، اصول پرستی اور نظم وضبط کا احترام تھا کہ اس واضح ناراضگی کے باوجود کبھی وہ ایسے موقعوں پر مدرسہ کے انتظامی امور میں مداخل نہیں ہوئے۔

ان کا کہنا تھا کہ طلباء کا اخراج نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بڑی غلطی کردی جس سے مدرسہ کا ماحول اور نظام خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو اس طالب علم کو خوبصورتی سے تنہائی میں سمجھا بجھا کر اخراج کا عنوان دیئے بغیر کسی دوسرے مدرسہ میں بھیج دینا چاہئے۔ طالب علم کو سمجھا دیا جائے کہ تمہارے لئے یہ مدرسہ اور یہاں کا ماحول مناسب نہیں رہا، ہوسکتا ہے کہ تم دوسری جگہ کامیاب ہو جاؤ اور اگر تم چاہو تو ہم وہاں کے ذمہ داروں کو تمہارے لئے سفارشی خط لکھ دیں۔ لیکن تم وعدہ کرو کہ اس غلطی کا اعادہ وہاں نہیں کرو گے۔

علامہ صاحب فرماتے تھے کہ ہم نے اس طرح طالب علموں کو ادھر ادھر بھیجا (یعنی ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں منتقل کردیا) تو وہ کامیاب ہوگئے۔ اخراج کرنے سے طلباء کی زندگی پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

کامیابی ہمیشہ نرمی سے ملتی ہے

فرماتے کہ ”تجربہ یہی ہے کہ طالب علموں کو جہاں تک ہوسکے شفقت کے ساتھ رکھنا چاہئے۔ سختی سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ ہمیں تو آج تک ہوئی نہیں۔ جہاں کامیابی ہوتی ہے نرمی سے ہوتی ہے۔“

وہ خود اپنا حال بتایا کرتے تھے کہ حفظ کی تکمیل میں جب چھ پارے رہ گئے اور تعلیم سے دل اچاٹ ہوگیا تو مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے میری شرطیں مان کر حفظ قرآن پورا کرادیا۔ اور دو سال بعد پھر دوبارہ شفقت و نرمی سے سمجھا کر تعلیم

تعلیم پر لگایا(۱) اس لئے میں تو طلباء کے ساتھ شفقت اور نرمی کا ہی قائل ہوں اسی طرح کامیابی ملتی ہے۔

کوئی طالب علم غلطیاں کرے یا تعلیم میں اس کی دلچسپی نہ ہوتو مایوس ہوکر اس کا اخراج نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ مدرسہ کا ماحول اس لڑکے سے خراب ہوتا ہوتو اخراج کا عنوان دیئے بغیر اچھی طرح ہمدردی سے سمجھا کر اور آئندہ غلطی نہ کرنے کا وعدہ لیکر کسی دوسرے مناسب مدرسہ میں بھیجدینا چاہئے بہت ممکن ہے کہ وہ وہاں جاکر کامیاب ہوجائے اور اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔

شقی ازلی اور سعید ابدی، ایک سبق آموز واقعہ

حضرت علامہ صاحب اس سلسلہ میں اکثر ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک شخص حضرت شیخ عبد القادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوا تو شیخ نے اس سے فرمایا کہ تو شقی ازلی ہے تجھے ہم سے کیا فائدہ ہوگا اور اس کو بیعت نہیں کیا۔ لیکن وہ شخص اپنی اصلاح سے مایوس نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ایک بزرگ شقیق رحمت زیفائی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور وہ حضرت شیخ جیلانی کی طرح اتنے مشہور بھی نہیں تھے۔ وہ شخص ان کے یہاں چلا گیا، اپنا حال بیان کیا اور بیعت ہونے کی درخواست کی، انہوں نے فرمایا کہ آجاؤ تم بھی شقی ہو ہم بھی شقی۔ دونوں ملکر بیٹھیں گے، اور ان کو کچھ معمولات وغیرہ بتلائے۔ چالیس دن تک ان کی تربیت کی اور چالیس دن گزرنے کے بعد اس شخص کو اللہ نے جب سعادت مندی عطا فرمائی تو حضرت زیفائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ جاؤ پیر صاحب سے مل کر کے جانا، سلام کرنا اور دعاء لیکے جانا۔

(۱) تفصیل ص ۱۸، ۱۹ پر گذر چکی ہے

چنانچہ جب وہ شخص حضرت شیخ جیلانی کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کو دیکھ حضرت شیخ نے فرمایا کہ بھائی شقی ازلی کو سعید ابدی بنا دینا ہمارے بس کی بات نہیں یہ حضرت زیفائی ہی کی ہمت ہے۔

طالب علم کی غلط راہ پر پڑنے سے حفاظت

علامہ صاحب فرماتے تھے کہ اس واقعہ سے ہم یہ سمجھے کہ ایک طالب علم اگر ایک مدرسہ میں کامیاب نہیں ہوتا تو دوسرے مدرسہ میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اگر ایک استاذ سے اس کو مناسبت نہیں ہوتی تو دوسرے استاذ سے مناسبت ہوسکتی ہے اس لئے کسی طالب علم کو کسی ایک غلطی یا عدم مناسبت کی وجہ سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے اوپر شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ حتی الامکان اس کو علم کی راہ پر لگانے کی کوشش کی جائے ہاں اگر کلیتًا مایوسی ہو جائے اور یہ یقین ہو جائے کہ وہ علم حاصل نہیں کرسکتا تو پھر اس کے لئے دوسری مناسب راہ سوچی جائے ہمدردی کے ساتھ اس کی مناسب رہنمائی کی جائے اور اس کو حلال روزی کمانے کے راستے بتائے جائیں اگر ہوسکے تو ابتدائی مالی تعاون بھی کر دینا چاہیئے، چاہے بطور قرض ہی کیوں نہ ہو، تاکہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرسکے اور غلط راستے پر پڑنے سے محفوظ رہے۔

طلباء کو تنبیہ سے متعلق ایک واقعہ

حضرت علامہ صاحب کو اس بات کا خاص طور پر خیال رہتا تھا کہ طلباء نماز کی پابندی کا اہتمام کریں اور جن طلباء کی نماز یا رکعت چھوٹ جاتی ان کو سخت تنبیہ کرتے اور اکثر ان کی پٹائی بھی کر دیا کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی ان کا اعتدال اور شفقت ظاہر ہو جاتی۔ ایک دفعہ کا واقعہ علامہ صاحب سنایا کرتے تھے کہ جلال آباد فجر کی نماز میں ایک بار بہت سارے بچوں کی نماز اور رکعت چھوٹ گئی۔ مجھے

غصہ آیا اور نماز کے بعد میں نے ان تمام طلباء کو الگ کھڑا کر کے لائن لگوادی جن کی جماعت یا رکعت چھوٹی تھی۔ اور قمچی منگوا کر نمبر سے سب کی پٹائی شروع کردی، ایک طالب علم جو بہت محنتی، انتہائی شریف، اور نماز کا سخت پابند تھا اور فرائض نماز کے ساتھ سنن ونوافل کی بھی خاص پابندی کرتا تھا اس دن اس کی بھی رکعت نکل گئی اور وہ بھی سب کے ساتھ لائن میں لگا ہوا تھا۔ لیکن اتفاق سے میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ اور جب اس پر میری نظر پڑی تو میں لائن میں لگے ہوئے کئی لڑکوں کی پٹائی کر چکا تھا۔

اب نہ تو یہ ہوسکتا تھا کہ اس کی وجہ سے باقی طلباء کو بغیر پٹائی کے چھوڑ دوں اور نہ یہ کرسکتا تھا کہ سب کی تو پٹائی کروں اور اس کو ایسے ہی جانے دوں۔ اس کی بھی رکعت نکلی تھی اور سب کے ساتھ لائن میں لگا ہوا تھا اس لئے ضابطہ کے مطابق اس کی بھی پٹائی ضرور ہونی تھی۔ لیکن وہ چونکہ ہمیشہ نماز کی پابندی کرتا تھا اور اسی دن اتفاق سے اس کی رکعت نکل گئی تھی اس لئے میرا دل اندر سے بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کی پٹائی کروں۔ کیوں کہ اس طرح کی اتفاقی غلطی پر پٹائی کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن میں ضابطہ کے خلاف بھی نہیں کرسکتا تھا، ابھی اس کا نمبر آنے میں چند طلباء درمیان میں باقی تھے اور وہ سر جھکائے لائن میں کھڑا تھا اس کی بھولی صورت کو دیکھ کر میں بار بار دل میں عجیب سی الجھن اور بے چینی محسوس کر رہا تھا کہ ایسے شریف محنتی اور پابند طالب علم کی پٹائی کیسے کروں گا؟ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی کر رہا تھا کہ یا اللہ اس کے بچاؤ کا کوئی طریقہ نکال دے۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ اس طالب علم سے پہلے نمبر پر جو لڑکا کھڑا تھا وہ انتہائی شریر طالب علم تھا اور مختلف حرکتوں کی وجہ سے اکثر اس کی پٹائی ہوا کرتی تھی۔

میں نے اس شریر لڑکے سے پہلے کھڑے ہوئے ایک طالب علم کو جیسے ہی قمچی ماری تو اس شریر طالب علم نے سمجھا کہ مجھے ہی مار رہے ہیں، اس نے دونوں

ہاتھ اٹھا کر بہت زور سے شور مچانا شروع کر دیا ''اجی مر گیا جی'' اجی مر گیا جی''
حالانکہ اسکے ابھی لگا بھی نہیں تھا، اسکی اس حرکت پر مجھے ہنسی آ گئی، میں نے قمچی
پھینک دی اور باقی سب طلباء کو ایسے ہی بھیج دیا، کمرے میں آ کر میں نے اللہ تعالیٰ
کا بہت شکر ادا کیا کہ اس بہانے وہ نیک طالب علم پٹائی ہونے سے بچ گیا۔(۱)

عمومی احترام اور بلند اخلاق

بہر حال یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت علامہ رفیق احمد صاحب مفتاح العلوم جلال آباد کے علمی افق پر چھائے ہوئے تھے طلباء ان سے بہت محبت کرتے تھے اور دل سے ان کا احترام کرتے تھے وہ طلباء بھی جو ان کے درس میں شامل نہیں تھے یا ان کی خدمت میں آنا جانا نہیں تھا وہ بھی خود کو ان سے قریب محسوس کرتے تھے ان کی علمی رفعت کے باعث ہم عصر علماء میں بھی ان کو ایک خاص عظمت و مقبولیت حاصل تھی، حتی کہ بعض وہ علماء حضرات جن کو معاصرت کے باعث ان سے کچھ بعد اور مشاجرت تھی، وہ بھی ان کی خداداد علمی صلاحیتوں اور اخلاق و کردار کی بلندی کے باعث ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

کسی موقعہ پر کوئی قابل قدر عالم اگر کسی وجہ سے نظریں چراتا تو خواہ وہ عمر اور علمی مرتبہ میں ان سے کم ہوتا۔ لیکن وہ خود آگے بڑھ کر سلام میں پہل کر کے اس کے حال چال دریافت کرتے۔

مفتاح العلوم جلال آباد میں ان کا رعب بھی طلباء پر (حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے بعد) اساتذہ میں سب سے زیادہ تھا۔ حالانکہ وہ ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کے فروغ کے قائل نہ تھے۔ ممکن ہے وہ کسی وقت سخت گیر بھی رہے ہوں لیکن ہم نے ان کا جو زمانہ دیکھا اس میں عفوو چشم پوشی اور شفقت نمایاں تھی۔ طلباء

(۱) بروایت مولانا مستقیم احمد صاحب

ان کا غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ اگر اتفاقاً طلباء کی کسی شرارت پر ذرا اونچی آواز میں تنبیہ فرما دیتے تو سناٹا طاری ہو جاتا اور طلباء سہم جاتے۔ حالانکہ انکی بھاری اور زوردار آواز میں (جوان کی متوازن جسامت اور پرکشش شخصیت کے بالکل مناسب تھی) گرج اور کڑک کے بجائے ایک قدرتی کشش اور اپنائیت تھی۔

تدریس کے ساتھ مدارس کی سرپرستی

اپنی تدریسی خدمات کے ساتھ علاقے کے مدارس کی سرپرستی بھی بڑی ذمہ داری اور ہمدری کے ساتھ فرماتے تھے۔ اس کے لئے ان کو اپنے آرام کا بھی خیال نہ رہتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو قابل رشک جسمانی صحت سے نوازا تھا۔ جس کا استعمال وہ دینی خدمات کے لئے بڑی دریا دلی بلکہ بڑی بے رحمی کے ساتھ فرماتے تھے، دیہاتی مدارس کے لئے پیدل اور معمولی سواری پر سفر کرنا ان کے لئے عام بات تھی۔

سفر سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ

کبھی کبھی اپنے سفر کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ جن میں عبرت ونصیحت بھی ہوتی تھی اور مزاح وخوش ذوقی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا۔

گوگوان: قصبہ شاملی کے پاس گوجروں کی ایک دورافتادہ بستی ہے۔ وہاں ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ جس کے علامہ صاحب نگراں وسرپرست تھے۔ حضرت علامہ صاحب نے سنایا کہ ایک بار ہم وہاں جلسہ میں گئے۔ دیر سے چلے تھے شاملی جاتے جاتے دن چھپ گیا، آگے کے لئے سواری کا انتظام نہ ہمارے پاس تھا اور نہ وہاں سے کوئی آدمی آیا۔ مغرب کے بعد ایک تانگہ والا ملا، اس سے بات کر کے بڑی مشکل سے وہاں تک چلنے پر آمادہ کیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا راستہ کچا اور غیر مانوس تھا۔ تانگے والا خدا خدا کر کے کسی طرح گاؤں کے قریب تک لے گیا۔

لیکن چونکہ اندھیرا تھا اور تانگہ والا بھی کسی اور جگہ کا رہنے والا تھا۔ وہ اس گاؤں کے راستوں سے واقف نہ تھا۔ اس لئے گاؤں کے قریب پہنچ کر تانگہ ایک گڈھے میں جاگرا، ہم لوگ اندر گڈھے میں اور تانگہ ہمارے اوپر۔ وہاں شور شرابہ ہواتو گاؤں کے گوجر دوڑے آئے، ہم کو گڈھے سے نکالا۔ اپنے انداز اور اپنی زبان میں افسوس ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے بار بار کہتے رہے ارے ہجرت تیرے تو چوٹ بھی لگ گئی ہوگی۔

سائیکل سے سفر

اسی طرح ایک بار ٹانڈہ (متصل چھپرولی) مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا۔ کاندھلہ بڑوت روڈ پر رمالہ ایک بس اسٹاپ ہے۔ وہاں اتر کر وہاں سے پھر ٹانڈہ کیلئے بس ملتی ہے۔ ٹانڈہ رمالہ سے تقریباً سولہ (۱۶) کلومیٹر ہے۔

چنانچہ علامہ صاحب ٹانڈہ جلسہ میں شرکت کے لئے جلال آباد سے رمالہ پہنچے تو ٹانڈہ جانے والی آخری بس جاچکی تھی۔ رات کا وقت تھا سواری کا کوئی بھی انتظام نہیں تھا۔ اتفاق سے ایک سائیکل سوار مل گیا، علامہ صاحب نے اس پر بوجھ بننا بھی گوارا نہیں کیا۔ بلکہ اسکو سائیکل پر پیچھے بٹھایا اور خود سائیکل چلا کر ٹانڈہ تک لے گئے۔

دورافتادہ بستیوں کے اسفار

جب مدارس میں سالانہ جلسوں کا دور چلتا تو ان کی ڈائری میں کوئی تاریخ خالی نہ ملتی، صبح کہیں شام کہیں۔ جلال آباد رہتے ہوئے ان کے پاس اپنی گاڑی وغیرہ کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، بسوں اور ٹرکوں سے ہی وہ سفر کرتے، میلوں تک پیدل سفر کرنا ان کے لئے عام بات تھی۔ انہوں نے بعض ایسی بستیوں میں بھی مدارس قائم کرائے جہاں سواری جانے کا کوئی صحیح راستہ ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی دور

افتادہ اور چھوٹی جگہ پر ضرور جاتے ۔ بلکہ ایسی جگہ کو اپنے پروگرام میں ترجیح دیتے تھے اور ان کو وہاں پہنچنے میں کتنی ہی دقت اور کیسی بھی دشواری پیش آتی ان کی کشادہ پیشانی پر کبھی شکن نہ آتی ۔

نیند پر اختیار

حضرت علامہ صاحبؒ کو نیند پر بھی غیر معمولی حد تک کنٹرول تھا، مدارس کے جلسوں کے موقعوں پر ہفتوں تک ان کو باقاعدہ آرام کی فرصت نہ ملتی تھی اور وہ کسی بھی وقت تھوڑا بہت ستا لیتے ، ویسے موقعہ نہ ملتا تو اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے ہی چہرہ ہاتھوں پر ٹکا کر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اس طرح تکان اتار لیتے کہ ساتھ بیٹھنے والوں کو اندازہ نہ ہو کہ وہ سو رہے ہیں یا ویسے ہی آنکھ بند کئے بیٹھے ہیں ۔ بارہا ایسا ہوتا کہ یوں ہی لیٹے ہوئے متعلقین وشاگردوں سے باتین کرتے رہتے اس دوران کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند ہوتی اور خراٹوں کی آواز آنے لگتی ۔ چند منٹ کے بعد پھر آنکھیں کھولتے اور باتیں کرنے لگتے اس طرح وہ نیند بھی پوری کر لیتے اور ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتے رہتے ، بہر حال نیند اور آرام کو وہ ایک ضمنی سا درجہ دیتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے کسی پروگرام میں خلل نہ پڑتا تھا ۔

ہمدردی و خیر خواہی

علامہ صاحب کی شخصیت سے مدرسہ والوں کو تسلی ڈھارس اور حوصلہ ملتا ، اور وہ خاندان کے ایک سرپرست کی طرح ان کے مسائل سنتے اور ان کو مشورہ دیتے تھے ، عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کوئی مدرسہ کسی بحران وانتشار کا شکار ہوتا ہے تو لوگ اس سے دامن بچانے اور جان چھڑانے کے بہانے تلاش کرتے ہیں ۔ میں نے علامہ صاحب کو دیکھا کہ وہ ایسے نازک اور پریشانی کے وقت میں دور سے نصیحتیں کرنے کے بجائے مدرسہ کے ذمہ داروں کے اور زیادہ قریب

ہوجاتے، اور جس طرح کا بھی تعاون ان کے لئے ممکن ہوتا اس کو اپنا فرض سمجھ کر پورے خلوص سے کرتے۔ انہیں دوسروں کے دکھ درد اور پریشانیوں میں حصہ دار بن کر قلبی تسکین ملتی تھی۔ اور مصیبت کے وقت کسی کے کام آنے کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے تھے۔

تقریر و بیان کا ملکہ

اللہ تعالیٰ نے علامہ صاحب کو تقریر و بیان کا خاص ملکہ اور بہترین سلیقہ عطا فرمایا تھا ان کی قادر الکلامی اور انداز خطابت قابل رشک تھے وہ مجمع پر پوری طرح حاوی ہوجاتے ان کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے غضب کی تاثیر دی تھی۔ علم و احسان کے باریک نکات اور اعلیٰ اصطلاحات کو بڑے سہل اور شگفتہ انداز میں اس خوبصورتی و کامیابی کے ساتھ بیان کرتے کہ گاؤں دیہات کے ان پڑھ لوگ بھی آسانی سے سمجھ لیتے۔ حکایات و لطائف کو بروقت استعمال کرتے اور جب قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی زبان پر آتی تو جلال و تمکنت اور عشق و سوز کی ایک خاص کیفیت کا اندازہ ہوتا۔ چنانچہ سینکڑوں چھوٹے بڑے مدارس کے سالانہ جلسوں اور علمی تقاریب میں بڑے اصرار واہتمام سے ان کو دعوت دی جاتی، اور پورے احترام سے ان کی تقریر سنی جاتی۔ جو بسا اوقات جلسے کا ماحصل سمجھی جاتی تھی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ وہ کسی خاص موضوع پر تقریر کررہے ہوتے اور تقریر کے دوران ہی کسی دیگر غیر متعلق موضوع پر روشنی ڈالنے یا کسی خاص واقعہ کے بیان کرنے کی سفارش آہستہ میں کسی کی طرف سے ہوتی، تو علامہ صاحب اس فرمائش کو اس رازداری اور خوبصورتی کے ساتھ پوری کردیتے کہ نہ تو مضمون اور موضوع کا تسلسل ٹوٹتا۔ نہ بیان میں پیوند کاری محسوس ہوتی۔ یہ دراصل تقریر و خطابت کی ایک اہم اضافی خوبی ہوتی ہے

جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطاء فرمائی تھی۔

غریبوں کی دعوت

میں نے بعض علماء کو اس مرض میں بھی مبتلا دیکھا کہ اول تو کسی غریب کی دعوت کم ہی قبول کرتے ہیں اور اصرار کے بعد کسی مصلحت سے کھانے چلے بھی گئے تو انداز ایسا ہوتا ہے کہ جیسے اس غریب کی سات پشتوں پر احسان کر دیا ہو۔ علامہ صاحب کا مزاج اس کے برخلاف تھا۔ وہ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں میں ایسے گھل مل جاتے جیسے انہیں کے خاندان کے فرد ہوں، دعوت ہوتی تو بے تکلفی سے کھاتے اور کھانے کے بعد میزبان سے مصافحہ کرتے اور اس کے لئے دعاء کرتے، وہ گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور گاؤں ہی میں پرورش پائی۔ اور تعلیم بھی گاؤں اور قصبات میں ہوئی۔ اس لئے ان کی طبیعت میں گاؤں والوں سے بے تکلفی اس درجہ پختہ ہوگئی تھی کہ ان کی زبردست عالمانہ حیثیت بھی اس بے تکلفی میں آڑے نہیں آئی، ناشتہ اور کھانے میں بازار سے منگائی ہوئی چیزوں کے بجائے گھر میں بنی ہوئی چیزوں کو پسند فرماتے اور جو بھی کھانا ہوتا شوق ورغبت سے تناول فرماتے۔

مدارس میں تشریف لے جاتے تو البتہ گاؤں میں دعوت ہونے کے بجائے اس کو بہتر سمجھتے کہ مدرسہ ہی میں کھانے کا انتظام ہو۔

عظمتِ اخلاق کا ایک واقعہ

آدمی کی حق پرستی اور اخلاص کی ایک بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کے کسی قول یا عمل کے خلاف کوئی واضح مدلّل بات سامنے آتی ہے تو اگرچہ اس بات کو پیش کرنے والا اس سے ہر طرح چھوٹا ہو۔ مگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف اور صحیح بات کے قبول کرنے میں کوئی باک یا توہین محسوس نہیں کرتا۔ اس کو اپنی عزت اور

انا کا مسئلہ نہیں بناتا۔ ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم نہیں رہتا۔ یہ صفت کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔تاہم یہ جنس کمیاب اپنے موصوف کو عظیم بنا دیتی ہے۔ حضرت علامہ صاحب نے کئی مواقع پر اپنی اس عظمت کا ثبوت پیش کیا۔

ایک عالم دین نے مجھے بتایا کہ ایک جلسۂ عام کے دوران حضرت علامہ صاحب اپنی تقریر میں اس بات پر نکیر فرما رہے تھے کہ بعض حضرات مولوی ہونے کے بعد طب وغیرہ میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ اور پھر اپنا حلیہ اپنا رہن سہن اور عالم دین ہونے کے سارے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اسی ڈگری اور پیشہ کو زیادہ معزز سمجھنے لگتے ہیں۔ گویا گھوڑے سے اتر کر گدھے کی سواری کو بہتر اور محترم سمجھتے ہیں۔ جس سے علم دین سے ان کی بے وفائی تو ظاہر ہوتی ہی ہے۔ علم دین کا استخفاف اور بعض اوقات استہزاء بھی ہو جاتا ہے جو ایک خطرناک بات ہے۔

لیکن غالباً اس وجہ سے کہ وہاں تقریباً سبھی یا تو عوام کا مجمع تھا یا پھر علماء میں وہ حضرات تھے جو بالعموم ان کے شاگردوں کے زمرہ میں آسکتے تھے۔ علامہ صاحب اس حساس موضوع کو پوری احتیاط اور وضاحت کے ساتھ بیان نہ کر سکے۔ یعنی یہ کہ عالم دین ہونے کے بعد بھی طب یا کسی دوسری ڈگری کے حصول کی کوئی ممانعت نہیں۔ ہاں! اپنا حلیہ، رہن سہن اسلامی ہو اور دین کے تئیں اپنی محبت اور عظمت میں کوئی کمی نہ آئے۔ بلکہ اگر اس طرح کوئی زیادہ ڈگریاں حاصل کر لے تو وہ یقیناً مفید ومحمود ہے۔ یہ سب چیزیں قابل شکایت ملامت اس وقت بن جاتی ہیں جب دین وشعائر دین کے استخفاف کا ذریعہ بن جائیں۔

حضرت علامہ صاحب خود اسی ذہن کے داعی تھے۔ بلکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ صرف طب یونانی سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ جدید میڈیکل سائنس کا حصول ضروری ہے۔ آپریشن کرانے مسلمان کہاں جائے گا؟ اس لئے ضرورت ہے کہ

ہم اپنے میڈیکل کالجز قائم کریں اور جدید طرز پر ہسپتال چلائیں۔

لیکن بہر حال اس دن کچھ صحیح ڈھنگ سے وضاحت نہیں ہوسکی۔ جس سے عام سامعین کو کچھ ایسا پیغام ملا گویا طب یا صنعت علم دین کے منافی ہے اور کسی عالم دین کو ڈاکٹر نہیں بننا چاہیے یا اس کو بطور پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اتفاق سے اسٹیج پر ایک ایسے نوجوان عالم دین بھی موجود تھے جو مولوی ہونے کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھے اور الحمد للہ ان کی دینداری اور دینی عظمت و دینی خدمت میں ڈاکٹر ہونے سے کچھ اضافہ ہی ہوا تھا بعض سطحی قسم کے (نیم مولوی و نیم ڈاکٹر) کی طرح ان کا حلیہ مضحکہ خیز نہیں بنا تھا۔ اس لئے فطری طور پر ان کو یہ بات ناگوار محسوس ہوئی۔ اور چونکہ ان کا اپنا کردار اور شخصیت خود ایک دلیل تھی اس لئے انہوں نے حضرت علامہ صاحب کی تقریر کے بعد وقت لیکر احادیث کی روشنی میں بتایا کہ علم طب علم دین کے منافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی علوم نبوت کا ہی ایک جزء ہے، اجلاس ختم ہوگیا۔ حالانکہ مجمع کے تقریباً سبھی عوام وخواص نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا کہ ایک نوجوان عالم حضرت علامہ صاحب کے بیان پر نکیر کرے۔

لیکن علامہ صاحب کے چہرے پر کوئی شکن نہیں آئی، بلکہ اس کے ایک ہفتہ بعد چند علماء کرام جو اس اجلاس میں شریک تھے جب کسی پروگرام کی تاریخ لینے علامہ صاحب کے پاس گئے تو سلام دعاء کے فوراً بعد فرمایا کہ "بھائی اس دن ہم سے بھول ہوگئی تھی بات وہی صحیح ہے جو مولوی...... صاحب نے کہی" ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے"۔ بعد میں خود ان مولوی صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ ہے وہ صفت، جس سے کسی آدمی کے عظیم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں حضرت علامہ صاحب کی عظمت کا اسی دن قائل ہوگیا کہ انہوں نے اپنے سے بہت چھوٹے آدمی کی مجمع عام میں نکیر پر ناراضگی

ظاہر کرنے کے بجائے پوری فراخ دلی سے اپنی بھول کا اعتراف کرلیا۔(۱)

جلال آباد میں تدریس

حضرت علامہ رفیق احمد صاحب نے مفتاح العلوم جلال آباد میں پچیس سال تک درس حدیث کی خدمات انجام دیں اور اپنے جوہر علم سے یہاں کے طلباء کو بڑی دریا دلی کے ساتھ فیضیاب کیا۔ جلال آباد میں ان کو گھر سے بھی زیادہ سکون ملتا تھا ہمارے زمانہ طالب علمی میں ایک دفعہ علامہ صاحب کو درد گردہ کی شکایت ہوئی، سخت بیمار ہوگئے حالانکہ وہ رخصت پر تھے کیوں کہ درسگاہ تک جانا اور سبق پڑھانا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن اس دوران بھی گھر کے بجائے وہ زیادہ وقت مدرسہ ہی میں رہے سردیوں کا زمانہ تھا وہ دن میں زیادہ وقت اپنے کمرہ سے باہر مدرسہ کے صحن میں چارپائی پر لیٹے رہتے تھے گرم پانی سے بھری ہوئی ربر کی بوتل درد کی جگہ پر لگی رہتی طلباء آتے جاتے رہتے ہلکی پھلکی علمی گفتگو اور لطائف چلتے رہے تھے۔

فریب وتدبیر کے فرق پر گفتگو

اسی دوران ایک مجلس میں یاد پڑتا ہے کہ مکر وتدبیر (فریب وتدبیر) کے فرق پر بات ہورہی تھی علامہ صاحب نے فرمایا: مکر وہ ہے جس سے دوسرے کا نقصان ہوکر اپنا فائدہ ہوتا ہو اور تدبیر وہ ہے جس سے اپنا فائدہ ہوجائے لیکن دوسرے کا نقصان نہ ہو اس لئے تدبیر جائز ہے۔ اور مکر ناجائز ہے۔ اس کی ایک مثال بتاتے ہوئے علامہ صاحب نے فرمایا کہ ایک بڑے میاں تھے، ان کے تین لڑکے تھے۔ بڑے میاں بیمار ہوگئے، لڑکوں کے دل میں باپ کے لئے کوئی محبت نہ تھی اس لئے کوئی بڈھے کے قریب نہ لگتا تھا وہ اکیلا ہی بیماری میں تڑپتا رہتا تھا۔

(۱) بروایت مولانا نثار احمد رڑکلی

اس کسمپرسی کی حالت میں بڑے میاں کو ایک تدبیر سوجھی، اس نے ایک تھیلی میں کچھ کنکریاں وغیرہ اس ساخت کی بھرلیں کہ سرسری طور پر دیکھنے سے اشرفیاں معلوم ہوں۔اس نے وہ تھیلی اپنے میان میں باندھ لی اور کسی کے ذریعہ یہ مشہور کردیا کہ بڑے میاں کی گرہ میں بہت مال ہے۔اور لڑکوں میں جو بھی اس کی خدمت کرے گا یہ مال اسی کو ملے گا۔اس بات کی بھنک جب لڑکوں کو پڑی تو لالچ میں سب کے سب اباجان کی خدمت میں جٹ گئے۔اور ہر ایک اپنے کو دوسرے سے زیادہ خدمت گار ثابت کرنے میں لگ گیا بڑے میاں کے مزے آ گئے ،خوب خاطر مدارات اور علاج معالجہ ہوتا رہا۔ بڑے میاں کبھی کبھی کسی بہانے سے وہ تھیلی باہر نکال کر ہلا دیتے تھے۔لڑکے تھیلی کو دیکھتے تو منہ میں پانی بھر آتا اور وہ تھیلی حاصل کرنے کے لالچ میں اور زیادہ خدمت میں لگ جاتے تھے۔یہاں تک کہ بڑے میاں کا انتقال ہوگیا۔

وفات کے بعد جب تھیلی دیکھی تو اس میں اشرفیوں کے بجائے کنکریاں بھری ہوئی تھیں۔تو گویا تدبیر کے ذریعہ بڑے میاں نے بیٹوں سے اپنا حق وصول کیا لڑکوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا اور بڑے میاں کا فائدہ ہوگیا۔

خلوت کا اثر

ایک دن طلباء نے کسی بزرگ کا تذکرہ کیا کہ وہ خلوت کدے میں رہتے ہیں، اور لوگ ان سے ملنے کی تمنا میں ہجوم وار آتے ہیں، اس پر خلوت و گوشہ نشینی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ صاحب نے فرمایا کہ سانپ ایک زہریلا جانور ہے اگر نظر بھی آجائے تو آدمی اس کی دہشت سے بھاگ جاتا ہے، لیکن یہ سانپ بھی جب سپیرے کی پٹاری میں بند ہوکر خلوت میں بیٹھ جاتا ہے تو سب لوگ سپیرے کے پاس اس کو دیکھنے آتے ہیں، اگر وہ سانپ جنگل میں پھرتا رہتا تو کوئی اس کو دیکھنے

نہ جاتا، اس کی گوشہ نشینی کی وجہ سے لوگ اس کو دیکھنے آتے ہیں۔

مدرسہ کے لئے اسفار

بہر حال مرض کی حالت میں بھی طلباء کی مجلس لگی رہتی اور علامہ صاحب علمی لطائف سے ان کی میزبانی فرماتے رہتے، ان کا اندازِ کلام بڑا دلچسپ اور بے تکلف تھا طلباء بھی ان سے مانوس تھے۔ وہ مفتاح العلوم کو ہی اپنا اصل گھر اور وہاں کے سب طلباء کو اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ انہوں نے مدرسہ کی تعمیر و ترقی کے لئے حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے ایماء پر دور دراز کے اسفار بھی کئے۔ چنانچہ ایک دفعہ علامہ صاحب نے بتایا کہ کئی بار ایسا ہوا کہ مدرسہ کے لئے دہلی سے بنگلور کا سفر کھڑے کھڑے کرنا پڑا۔ مفتاح العلوم ان کی زندگی کا جزو لاینفکبلکہ ان کی ذات کا ایک حصہ بن گیا تھا جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوا کرتے اور اگر جدا ہو جائیں تو دونوں ادھورے سے ہو جاتے ہیں۔

جی نہ چاہے تھا کہیں چھوڑ کے جانے کو
ہم نے معشوق بنا رکھا تھا میخانے کو

مفتاح العلوم جلال آباد سے علیحدگی کا المیہ

لیکن انسان کی تمناؤں اور امیدوں کے برخلاف بعض اوقات ایسے غیر متوقع حالات پیش آتے ہیں کہ وہ زندگی کا ایک المناک حادثہ بلکہ عبرت ناک عنوان بن جاتے ہیں۔ مفتاح العلوم کے اس اولین طالب علم، ہر دل عزیز استاذ اور باوقار شیخ الحدیث کو یہ اندازہ شاید کبھی نہ رہا ہوگا کہ اس کو اپنے اس چمنستان علمی جس میں ان کے لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے تک کا بہترین زمانہ گذرا، جس کی علمی فضاء برسہابرس تک ان کی شیریں گفتاری اور شگفتہ بیانی سے گونجتی رہی، جس کے قدموں کی آہٹ سے مفتاح العلوم کا چپہ چپہ بلکہ ذرہ ذرہ سالہا سال تک مانوس

رہا، عمر کے آخری حصے میں اپنے اس گلشن علمی کو الوداع کہہ کر جانا پڑے گا۔

۱۴۰۰ھ (۱۹۸۰ء) میں یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا یعنی حضرت علامہ صاحب کو مفتاح العلوم جلال آباد سے الگ ہونا پڑا۔ اور اس طرح عمر کے آخری لمحات تک مفتاح العلوم کی خدمت کرنے کی تمنا ان کے سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی وہ ساری زندگی اس ادارے کی خدمت کرتے رہے۔ اور جب ان کی عمر کا قافلہ اپنے آخری پڑاؤ کے قریب تھا، علیحدگی کا یہ حادثہ ان کے لئے ’’سنگ آمد و سخت آمد‘‘ کا مصداق بن گیا۔ عمر کے اس مرحلے میں یہ واقعہ ان کے لئے حقیقت میں ایک دل دوز اور المناک حادثہ تھا وہ کشتیٔ حیات جو زندگی کا سفر اب تک بہت کامیاب اور پرسکون طریقے پر طے کرتی آئی تھی۔ کنارے کے قریب آتے آتے اچانک بے رحم طوفان کی لپیٹ میں آ گئی اور زندگی کے جس حصہ میں ان کو زیادہ سکون اور تحفظ کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ وہیں سے ان کی پریشانیوں اور ابتلاء کے دور کا آغاز ہوا۔

قسمت کی بات دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

حالات و وجوہات کچھ بھی رہے ہوں ان کا ہمیں نہ تو پوری طرح علم ہے اور نہ ہم ان کو کریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ موٹی سی بات تو ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں مفتاح العلوم میں داخل ہونے والا یہ نوعمر طالب علم ۱۹۸۰ء میں جب اپنے بڑھاپے میں وہاں سے الگ ہوا تو حالات کی اس ستم ظریفی پر اس کا دل پارہ پارہ ہو گیا ہو گا۔

زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اور ظرف و حوصلہ کا امتحان

مفتاح العلوم سے علیٰحدگی ۔علامہ رفیق احمد صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ جس کو انہوں نے اپنی روایتی فراخ دلی سے قبول کر کے پورے حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا حالات کا زہر گھونٹ گھونٹ کر پیتے رہے۔ لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور حدیث پاک سے ان کے شغف کی برکت تھی کہ اس واقعہ کی تلخی کو انہوں نے اپنی ذات پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

اس انجمن میں ہم بھی عجب وضع دار ہیں
دل ہے لہو لہان جبیں پر شکن نہیں

مفتاح العلوم جلال آباد سے علیٰحدگی کے بعد ان کے پاس بعض ایسی پیش کش بھی آئیں جن کو قبول کر کے اور اپنی شہرت و مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر وہ مفتاح العلوم کو کچھ نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ جلال آباد ہی میں بعض حضرات نے ایک دوسرے مدرسہ میں ان کو بٹھانا چاہا۔ لیکن علامہ صاحب کے ضمیر نے گوارہ نہ کیا اور ان کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی ہر جگہ حاوی اور فتح مند رہی۔

عام طور پر ایسے حالات میں آدمی کے ظرف اور حوصلے کا بھی امتحان ہوتا ہے، لیکن علامہ صاحب نے ان سخت ترین حالات میں جس اعلیٰ ظرفی حوصلہ مندی اور شرافت طبع کے ساتھ خود داری کا ثبوت دیا اور اپنے سارے دکھ آنسوؤں میں بہانے کے بجائے مسکراہٹوں میں چھپا لئے، اس سے ان کی پختہ رنگ شخصیت کا نقش زندہ جاوید ہو گیا، یہ ان کی شرافت اور بلند حوصلگی کا ہی ثبوت ہے کہ اتنا بڑا حادثہ پیش آنے کے باوجود ان کو اپنے محسن استاذ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب سے محبت و احترام کا جو تعلق تھا وہ آخری دم تک قائم رہا مفتاح العلوم سے جو پیمان وفا انہوں نے پہلے ہی دن کر لیا تھا بدترین حالات میں بھی

اس پاکیزہ عہد اور مقدس رشتہ کو داغدار نہیں ہونے دیا کتنے ہی لوگ تھے جنہوں نے مسیحا کو قاتل کہلوانا چاہا، وہ حضرات اپنی جگہ مخلص ہی سہی، لیکن حضرت علامہ صاحب کی مروت واحسان شناسی نے حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے خلاف کبھی کوئی بات کہنا تو درکنار سننا بھی پسند نہیں فرمائی۔

ہمیشہ حضرت کا نام احترام سے لیتے اور ان کا ذکر اسی محبت وعقیدت سے کرتے جیسے کبھی زمانہ طالب علمی میں کرتے ہوں گے۔ اور آخری وقت تک ایک عقیدت مند شاگرد کی طرح حاضر ہوتے رہے۔ اور اپنے صاجزادگان اور متعلقین کو بھی ہمیشہ جلال آباد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ اعزہ ومتعلقین کی ایک خصوصی مجلس میں اپنے بڑے صاجزادے کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت والا کے متعلق بڑے یقینی لہجے میں فرمایا کہ ''مشرق سے مغرب تک چراغ لے کر پھر جاؤ۔ ایسا آدمی نہیں ملے گا''۔ جب بھی کہیں باہر سفر میں تشریف لے جاتے تو خواہ کیسی ہی عجلت ہو، وقت تنگ ہو، یا کوئی بھی دیگر مصروفیت، ہر حالت میں حضرت سے ملاقات کر کے اور دعائیں لے کر رخصت ہوتے۔

جلال آباد میں حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے مکان کا صدر دروازہ راستہ سے ذرا ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر ہے، عینی شاہدین کا بیان ہے کہ جلال آباد سے علیحدگی کے بعد بھی علامہ صاحب جب حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کے مکان پر حاضر ہوتے، تو غایت احترام میں صدر دروازہ سے دور ہی گاڑی رکوا لیتے اور وہیں اتر کر پیدل مکان میں حاضر ہوتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گاڑی مکان کے اندر لائے ہوں، حقیقت میں دلوں کے اندر بسنے والی محبت ملازمت اور رسمی تعلقات سے بہت بالاتر ہوتی ہے۔

ایک شریف اور اعلیٰ ظرف انسان

حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب کی شہادت

محبوب شاگرد کے دل پر لگنے والی اس چوٹ کا جہاں دیدہ استاذ کو بھی بخوبی اندازہ تھا، اور اس زخم کو جس وقار کے ساتھ انہوں نے ساری عمر چھپا کر رکھا۔ ان کی اس اعلیٰ ظرفی سے استاذ کی نظر میں شاگرد کی قدر و محبت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب حضرت علامہ صاحب کا ذکر آنے پر اکثر فرمایا کرتے تھے ''مولانا رفیق احمد صاحب بہت شریف اور اعلیٰ ظرف انسان ہیں''۔ علامہ صاحب کو جلال آباد سے علیحدگی کا تو بہت دکھ تھا لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ حالات کا ماتم کرنا ان کی عادت نہ تھی۔ ہاں! کبھی کبھی اس دکھ کا ظہور مخصوص حضرات کے سامنے ہو جایا کرتا تھا۔ مثلاً بے تکلفی میں زبان سے اس طرح کے کلمات نکل جایا کرتے تھے کہ ''بیچ دریا میں کشتی ڈوب جائے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا، لیکن ہماری کشتی تو کنارے پر آ کے ڈوبی ہے''۔

پیکر صبر و رضا

عمومی طور پر وہ ہر حال میں ہنس مکھ اور شاداب دکھائی دیتے تھے، وہ رنج و مصائب، تلخ و تند حالات اور پریشانیوں کے بدترین دور میں بھی مسکرانے کا فن جانتے تھے، اگرچہ ان کی حساس طبیعت اور نرم و گداز دل کسی بھی بات اور واقعہ سے بہت جلد متاثر ہوتے۔ لیکن وہ کسی حادثہ کو اپنی باوقار و باوجاہت شخصیت پر مسلط نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں نے جلال آباد سے ان کی علیحدگی کے المیہ کے بعد ان کو ایسے مایوس کن حالات میں بھی مسکراتے اور ہنستے ہنساتے دیکھا ہے۔ جب ان کے شاگردوں اور متعلقین کو انہیں دیکھتے ہی رونا آ جاتا تھا۔ لیکن یہ علامہ

صاحب کی سراپا وقار و تمکین اور پیکر صبر و رضا شخصیت کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے ہر حالت میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ اندر کا غم آنکھوں سے چھلکنے نہیں دیا۔ اور حالات پر آنسو بہانے کے بجائے اپنے ہمدردوں کے آنسو بھی پی گئے، ان کے آنسو بہتے ضرور تھے لیکن صرف اس غیور و کریم اور ستار مولیٰ کے حضور میں، جس کے یہاں ان آنسوؤں کی قیمت سچے موتیوں سے ہزار ہا گنا زیادہ ہے۔ وہ اپنے اندر کا غم عام طور پر کسی کے سامنے ظاہر کرنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر ان کے اندرونی کرب کا اندازہ لگانا بھی بہت مشکل تھا۔ ان کی ظاہری حالت اور ہنس مکھ طبیعت پر ان کی قلبی کیفیت کو قیاس کرنے والوں کیلئے یہی کہا جاسکتا ہے۔

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے

تلخیٔ زیست تبسم میں چھپالیتا ہوں

بہت سی دفعہ ایسا ہوتا کہ مجلس عام میں کوئی سنجیدہ اور دل آزار موضوع چھڑ جاتا۔ لیکن علامہ صاحب اپنی خداداد اعلیٰ ظرفی اور ظرافت طبع (جو عالمانہ وقار و متانت کے دائرہ سے کبھی باہر نہ ہو پاتی) سے اس غمزدہ مجلس کو بھی اپنے کسی خوشگوار جملے سے لالہ زار بنا دیتے۔ اسی طرح کا ایک دلچسپ لطیفہ مجھے یہاں بھی یاد آرہا ہے۔ علامہ صاحب کو جلال آباد سے الگ ہوئے چند ماہ ہی گذرے تھے اور بعض بڑے مدارس سے علامہ صاحب کی تقرری کی پیش کش کے بارے میں سننے میں آرہا تھا۔

اسی دوران ایک مجلس میں حضرت علامہ صاحب کی جلال آباد سے علیحدگی کا تلخ و غمگین موضوع چل رہا تھا۔ ان کے متعدد شاگرد علمائے کرام بیٹھے ہوئے تھے

اور اپنے اپنے انداز میں اظہار تأسف کر رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت معلوم ہوا ہے کہ آپ جامعہ.........میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ نے کہا ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ فلاں جگہ سے بھی پیش کش ہے، فلاں جگہ سے بھی۔ لیکن ابھی کہیں بھی جانے کے لئے دل آمادہ نہیں ہے۔ پھر ذرا مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ’’بس یہ سمجھو کہ ابھی میں عدت میں ہوں‘‘ محفل ہنسی میں ڈوب گئی۔ اور اس طرح انہوں نے ایک سنجیدہ اور رنجیدہ محفل میں خوشگوار ماحول پیدا کر دیا۔

تلخئ زیست تبسم میں چھپا لیتا ہوں جو بھی غم ملتا ہے سینے سے لگا لیتا ہوں
ٹوٹ جائے نہ کہیں گردش ایام کا دل بارِ غم اسلئے ہنس ہنس کے اٹھا لیتا ہوں

جلال آباد سے محبت

تقریباً تیس سالہ خدمات کے بعد ان کو جلال آباد سے الگ ہونا پڑا۔ لیکن مفتاح العلوم جلال آباد کی محبت گویا ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی اور بہانہ بہانہ سے جلال آباد کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ جیسے کوئی بچھڑے محبوب کو یاد کرتا رہتا ہے۔ ایک دفعہ میں بھیسانی گیا، کئی دیگر علمائے کرام بھی ساتھ تھے۔ عشاء کا وقت ہو گیا تھا، علامہ صاحب اسی وقت باہر سے آئے تھے، عشاء کی نماز پڑھی، پھر باتیں شروع کرتے ہی فرمایا۔ کہیں بھی گھوم آؤ، سکون گھر پر ہی آ کر ملتا ہے۔ پہلے دو جگہ سکون ملتا تھا۔ ایک جلال آباد، دوسرے یہ گھر، اب صرف یہ گھر رہ گیا ہے۔

جلال آباد کا نام ان کی قرطاس زندگی کے تقریباً ہر صفحہ پر رقم ہے، مفتاح العلوم سے ان کو کمال درجہ انسیت اور عشق تھا۔ انہوں نے اپنی بہترین علمی صلاحیتیں اور اعلیٰ قابلیت مکمل طور پر مفتاح العلوم اور اس کے فرزندوں کی نذر کر دیں، وہ باہر

بھی مفتاح العلوم کا ذکر بڑے اعتماد کے ساتھ فرماتے تھے۔ اور جب وہ جلال آباد کا ذکر کرتے تو ان کے چہرے پر انسیت اور اپنائیت کی روشنی سی پھیل جاتی ان کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی جو اپنے عزیز ترین فرزند کے ذکر اور اس کی کامیابی و ترقی کی خوشیاں دیکھ کر قدرتی طور پر انسان کی آنکھوں میں در آتی ہے۔ میں نے بارہا محسوس کیا کہ مفتاح العلوم جلال آباد جہاں پر انھوں نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اپنی زندگی کا اکثر حصہ گذارا وہاں سے ان کو طبعی انسیت تھی۔

خودداری اور استغناء کا امتحان

کسی کی خودداری اور استغناء کا امتحان بھی دراصل ایسے ہی اضطراری اور بحرانی دور میں ہوتا ہے۔ جن حضرات نے علامہ صاحب کا وہ پریشانی کا وقت دیکھا ہے اور ان کی تنگیٔ حالات سے واقف ہیں یہ راقم بھی ان میں سے ایک ہے، اور حضرت علامہ صاحب کی میرے ساتھ یہ خصوصی عنایت بھی تھی کہ بعض اوقات تنہائی میں گفتگو فرماتے ہوئے اپنے ذاتی حالات وجذبات بھی کسی قدر ظاہر فرما دیا کرتے تھے۔ اس خصوصی واقفیت کی بناء پر میں گواہی دے سکتا ہوں کہ علامہ صاحب نے اپنی زندگی کے مشکل ترین حالات میں بھی اپنی خودداری کا سودا نہیں کیا۔

دستار علم کے وقار کی حفاظت

ایک دو واقعے خود میرے سامنے ایسے پیش آئے جو اس وقت تو میری عقل میں نہیں آسکے تھے لیکن اب گرم و سرد حالات اور مختلف ومتعدد شخصیات کے مطالعہ سے گذرنے کے بعد آج ان باتوں کو سوچتا ہوں تو علامہ صاحب کی عظمت کا ایک لازوال نقش دل میں ابھر آتا ہے۔ یہ اسی زمانہ کی بات ہے جب علامہ صاحب مفتاح العلوم سے علیحدہ کئے گئے تو ایک بڑے مدرسہ سے مہتمم وشیخ الحدیث کے عہدہ کی پیشکش آئی مدرسہ والوں کے اصرار اور اپنے حالات کے

پیش نظر علامہ صاحب نے بھی وہاں جانا منظور فرمالیا۔ پھر بات یہاں آ کر رک گئی کہ مدرسہ کے ذمہ داروں نے جب اس مدرسہ کے سر پرست (جو حضرت علامہ صاحبؒ کے ایک سابق دوست تھے) سے اس کا ذکر کیا تو سر پرست نے علامہ صاحب کو گویا ذہنی ونفسیاتی طور پر زیر کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ علامہ صاحب اگر آنا چاہتے ہیں تو میرے پاس آ کر کہیں کہ مجھے مدرسہ میں رکھ لیجئے۔

انہیں غالبًا یقین تھا کہ اس وقت علامہ صاحب حالات کی جس بھٹی میں سلگ رہے ہیں اس کی تپش کی تاب نہ لاکر وہ ہر طرح جھکنے اور ہر شرط ماننے پر مجبور ہوں گے۔ ہم لوگ بھی سوچ رہے تھے کہ ان کے پاس جا کر اتنی بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟ لیکن حضرت علامہ صاحب کی غیور طبیعت نے یہ سودے بازی قبول نہیں فرمائی۔ حالات کی ہر سختی کو جھیلا لیکن اپنی عزت نفس کو نیلام نہیں کیا۔ پریشانی اور مصیبتوں سے بھرپور اضطراری دور میں بھی دستار علم کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اور فرمایا کہ اگر مدرسہ میں میری ضرورت ہے تو وہ خود مجھ سے آ کر کہیں کہ آپ مدرسہ میں آ جائیں۔

اس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اونچا کر کے
ہم بھی اے دوست کلاہ دار ہیں اپنے گھر کے

اس کے علاوہ بھی اور اس سے بھی بڑے اور اہم مواقع ایسے آئے کہ اگر علامہ صاحب مصلحت پرستی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ضمیر کے خلاف سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو جاتے تو ان کو وہ سب کچھ بڑی آسانی سے مل جاتا جس کے لئے بہت سے حضرات کو نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انہوں نے کسی بھی باضمیر و خوددار انسان کی طرح صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہا۔ اور اس کے لئے نفع نقصان کی پرواہ نہیں کی۔

غرض حضرت علامہ صاحب جلال آباد سے علیٰحدگی کے بعد پورے ایک سال خالی گھر پر رہے اور اس بحرانی دور میں ان کی یہ حالت رہی کہ:

کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں مرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں مرے آنسوؤں کی روانیاں

لیکن اپنی زندگی کے اس مشکل ترین دور میں بھی انہوں نے کبھی اپنے علمی وقار پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔

اس کا کرم ہے مجھ پر کہ غربت کے باوجود
احسان دوستوں کا اٹھانے سے بچ گیا

مفتاح العلوم میں رہائش

مدرسہ مفتاح العلوم کے احاطہ میں رہائشی کمروں کی جو مشرقی قطار ہے اس کے شمالی سرے پر آخری کمرہ میں حضرت علامہ صاحب کا قیام رہتا تھا۔ مطبخ میں جانے کے لئے دونوں وقت اسی کمرے کے سامنے سے ہوکر جانا پڑتا تھا۔ لیکن طلباء کی عام گذرگاہ ہونے کے باوجود سب طلباء کی نظروں میں یہ ایک باوقار اقامت گاہ تھی۔ اس لئے اس کمرے کی طرف جاتے ہوئے احساس ادب غالب رہتا تھا۔ چک اٹھا کر اندر جانا اور علامہ صاحب کے پاس بیٹھنا طلباء اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے۔

مکاں کو ہے زینت مکین سے اسدؔ

لیکن مکان کی زینت وعزت اور وقار وافتخار مکین کے وجود سے ہی باقی رہتا ہے۔ مکین کے بغیر مکان کی حیثیت حقیقت میں کچھ نہیں رہ جاتی۔ ہاں بس ”کچھ یادیں، کچھ باتیں“ رہ جاتی ہیں۔ یہ ایک فطری قانون ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے اور شاید کبھی اس میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ میرا حضرت علامہ صاحب

کی علیٰحدگی کے کچھ عرصہ بعد مفتاح العلوم جانا ہوا اور جب اس کمرے کے سامنے سے گذر ہوا تو اچانک قدم دروازے کے سامنے رک گئے اب اس دروازے پر چک پڑی ہوئی نہ تھی۔ دونوں کواڑ چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ اب اس کمرے میں طلباء رہتے ہیں۔

میں چند سال پہلے کے اس زمانے کو یاد کرنے لگا جب اس کمرے میں علامہ صاحب کے پاس علماء وفضلاء کی بکثرت آمد ورفت رہتی تھی اب مکین کے بدلنے سے منظر بدل گیا تھا۔

تفریح کا شوق

تفریح کا مقصد یہ ہے کہ ذہن کو ہر قسم کے تفکرات اور دباؤ سے آزاد چھوڑ کر کسی ایسے شغل میں انہماک ہو جس سے دل ودماغ ہلکا پھلکا ہو اور طبیعت کا بوجھ ختم ہو کر فرحت وتازگی کا احساس ہو اس کے لئے مصنوعی نوایجاد شدہ طریقوں کے بجائے کائنات کے فطری مناظر سے لطف اندوز ہونا بہر طور مفید اور تسکین قلب وذہن وتفریح طبع کا باعث ہوتا ہے۔ حضرت علامہ صاحب کا ذوق بھی اس سلسلہ میں بالکل فطری اور طبع سلیم کے عین مطابق تھا چنانچہ آپ بتایا کرتے تھے کہ ”مجھے بچپن ہی سے کھیتوں میں ہریالی دیکھنے کا شوق ہے۔

جب میں گاؤں میں جاتا ہوں تو ایک دفعہ تو ضرور کھیت کو دیکھنے کے لئے جاتا ہوں۔ اور اس کھیت کو دیکھنا اچھا لگتا ہے جس میں فصل عمدہ کھڑی ہو۔ چاہے وہ اپنا نہ ہو کسی اور کا ہو۔ اور ایسے وقت میں اکیلے جانا ہی اچھا لگتا ہے، دل چاہتا ہے کہ اس وقت کوئی اور ساتھ نہ ہو تنہا ہی گھوم کر آؤں۔ مجھے زراعت کا شوق نہیں بس کھیتوں میں کھڑی ہوئی اچھی فصل دیکھنے کا شوق ہے۔ طبیعت میں فرحت وانبساط ہوتا ہے۔ بس یہی شوق مجھے ہے۔ باقی کسی زراعت، تجارت یا

صنعت میں مشغولیت کا کبھی ذہن میں خیال تک بھی نہیں آیا''۔

نرم دلی کی ایک مثال

حضرت علامہ صاحب طبعی اعتبار سے بہت نرم اور عفو وایثار میں ایک مثالی کردار رکھتے تھے۔ جس کا تجربہ راقم کو بھی بار ہا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ایک مدرسہ کے جلسہ میں گئے ہوئے تھے، میں بھی حاضر تھا۔ مہمانوں کی بھیڑ تھی، بعض مہمانوں کو لیٹنے کے لئے بستر بھی نہیں ملے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر ایسے موقع پر ہو ہی جاتا ہے، علامہ صاحب رات میں اپنے بستر سے اٹھ کر ضرورت کے لئے گئے اور جب واپس ہوئے تو دیکھا کہ اتنی دیر میں ان کے بستر پر دوسرا کوئی آدمی آکر لیٹ گیا۔ رات کا وقت تھا منتظمین حضرات بھی سو چکے تھے۔ آپ نے اس آدمی کو اپنے بستر سے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اور اسی کمرے میں ایک طرف کھڑے ہو کر نفلیں پڑھنے لگے، اس طرح بقیہ پوری رات نفلیں پڑھ کر گذار دی۔ صبح کے وقت پھر ہم لوگوں کو یہ قصہ سنایا اور اس طرح سنایا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں بس ایک لطیفہ ہو گیا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے اجازت وخلافت

جلال آباد میں تدریس کے دوران لفظ ''تصوف'' حضرت علامہ صاحب کو کبھی پسند نہیں آتا تھا۔ یہ اصطلاح ان کے لئے بہت غیر مانوس تھی اور اس سلسلے میں ان کا طرز گفتگو بارہا تلخی آمیز ہو جاتا تھا، جس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی بھی ہو جاتی تھی کہ وہ بزرگان دین کے اس طریق تربیت کے مخالف ہیں، جو تزکیہ واحسان کے لئے خانقاہی نظام کے طور پر جاری ہے۔ لیکن ان کی یہ

ناپسندیدگی صرف اس اصطلاح ''تصوف'' تک ہی تھی جس کو بعض غالی اور غیر شرعی حضرات نے بدنام کر رکھا ہے۔ خدانخواستہ اس کی اصل روح ''تزکیہ واحسان'' سے نہیں چنانچہ ان کا اصلاحی وروحانی تعلق حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب جلال آبادی سے طالب علمی کے زمانے سے ہی رہا اگرچہ حضرت سے باقاعدہ بیعت نہیں ہوئے۔ بعد میں پھر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے باقاعدہ بیعت کا تعلق رہا اور حضرت مہتمم صاحب نے آپ کو اجازت بھی دی اس وقت آپ کی جلال آباد سے علیحدگی ہوچکی تھی۔

جب ایک ساتھی نے مجھے اس بارے میں بتایا تو مجھے اس خبر سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اور چونکہ جلال آباد میں وہ ''تصوف'' والی بات بھی میرے ذہن میں تھی اس مناسبت سے یہ میرے لئے ایک دلچسپ خبر بھی تھی اسی لئے ایک موقعہ پر میں نے حضرت علامہ صاحب سے خود ہی دریافت کیا کہ حضرت! کیا حضرت مہتمم صاحب نے آپ کو اجازت دی ہے؟ تو فرمایا ہاں! اجازت دی! اور پھر تحریری اجازت باقاعدہ فریم کرا کے بھی مجھے عنایت فرمائی، اور یہ بھی فرمایا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے اجازت ہے۔

اسی سلسلے میں علامہ صاحب نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ ''حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی دارالعلوم کی خدمت سے سبکدوشی ہوگئی ہے۔ تھانہ بھون کی خانقاہ خالی ہے آپ اگر وہاں تشریف رکھیں تو بہت زیادہ فیض ہوگا گویا حضرت تھانویؒ کا فیض خانقاہ سے پھر از سر نو شروع ہوجائے گا۔ تو حضرت نے بہت ٹھنڈی سی سانس لیکر فرمایا کہ بھئی اب میرے بس کا یہ کام نہیں رہا، اب تم اس کام کو کرو''۔

میکدے کی راہ سے ہوکر گذر گیا

حضرت علامہ صاحب ان دنوں جس ذہنی کوفت اور نفسیاتی دباؤ کا شکار تھے، اور وہ ذہنی و قلبی اذیت میں مبتلا ہوکر جس طرح کے حالات سے دست و گریبان تھے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے اس روحانی تعلق سے ذاتی طور پر ان کو سکون ملا ہوگا۔

اہل اللہ سے قریبی قلبی تعلق کا یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ گردش ایام سے جو تکلیف اور آزمائش آدمی پر آتی ہے اس کو برداشت کرنے کی روحانی قوت اور اخلاقی طاقت اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور بدترین مخالف حالات پر بھی غالب آجانے کا حوصلہ مل جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ اس مناسبت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت مہتمم صاحبؒ سے حضرت علامہ صاحبؒ کا روحانی تعلق مضبوط نہ ہوتا تو ان حالات میں ان کی ذہنی اذیت اور بھی بڑھ جاتی۔ کیونکہ اس حالت میں ان کی قوت مدافعت شاید اتنی مضبوط نہ ہوتی، لیکن یہ قدرتی انتظام ہوا کہ ایک صاحبِ دل نے ان کے دل کی دنیا کو سنبھال لیا، جس سے ان کے سفینۂ حیات کا توازن برقرار رہنے میں مدد ملی۔

میں میکدے کی راہ سے ہوکر گذر گیا
ورنہ سفر حیات کا بیحد طویل تھا

دل کی دنیا آباد رہی

حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں کسی صاحبِ دل کی نگرانی میں ہی دل کی دنیا محفوظ رہ سکتی ہے اور وہی اس کو ویران ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اور اگر روح شاداب اور من کی دنیا آباد رہے تو باہر کے عارضی حالات آدمی کے استقلال و استقامت کو زیادہ متاثر نہیں کر سکتے۔ بس آدمی کا دل اور ضمیر زندہ رہے، یہ بہت

ضروری ہے۔ اور حضرت مہتمم صاحب سے ان کا تعلق ثابت کرتا ہے کہ علامہ صاحب کو دل کے زندہ رکھنے کی فکر تھی کہ دل کا زندہ رہنا ہی مدار حیات ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

حضرت مہتمم صاحبؒ کا معیارِ نظافت

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت علامہ صاحب نے ایک روز کہا کہ عام طور پر نظافت کا مطلب اور معیار یہ ہوتا ہے کہ بدن پاک صاف ہو، کپڑے صاف ستھرے ہوں، رہنے سہنے کی جگہ اور استعمال کی چیزیں نظیف ونفیس ہوں وغیرہ۔

لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ کا معیارِ نظافت بہت بلند تھا، اسلئے کہ ان کے یہاں ان تمام باتوں کے ساتھ اس کا بھی اہتمام تھا کہ زبان سے بھی کوئی نازیبا لفظ نہ نکلے۔ حتی کہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کے لئے بھی انہوں نے کبھی کوئی نامناسب بات زبان سے نہیں نکالی۔

شیخ فیملی ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے

حضرت علامہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شیخ سے امراض باطنی کے اظہار کے سلسلہ میں ایسی بے تکلفی ہونی چاہئے جیسے فیملی ڈاکٹر ہوتا ہے کہ اس سے آدمی کوئی حجاب نہیں رکھتا۔

سیاسی عزائم اور الیکشن کی تیاری

حضرت علامہ صاحب اعلیٰ درجہ کی سیاسی سوجھ بوجھ بھی رکھتے تھے اور کئی بار ان کے اندرونی سیاسی جذبات نے ان کو باقاعدہ عملی سیاست میں حصہ لینے پر

آمادہ کیا۔ لیکن ان کے اوپر یہ خیال ہمیشہ غالب رہا کہ وہ سب سے پہلے ایک عالم دین اور استاذ ہیں۔ اس طرح ان کے اندر کا شیخ الحدیث ان کے سیاسی عزائم پر غالب آجاتا۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے پارلیمینٹ کے لئے الیکشن لڑنے کی پوری تیاری اور ارادہ کرلیا تھا، کانگریس پارٹی سے ان کو ٹکٹ ملنا تقریباً طے تھا۔ لیکن جب انہوں نے مولانا مسیح اللہ خانصاحبؒ سے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا اور الیکشن لڑنے کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا کہ ''میں تو خانقاہ میں بیٹھ گیا۔ آپ الیکشن لڑلو اور مدرسہ کو تالا لگادو''۔ اس جواب کے بعد علامہ صاحب نے الیکشن لڑنے کا ارادہ دل سے نکال دیا، حضرت علامہ صاحب راجپوت برادری سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوراجپوتوں میں بھی ان کے لئے بڑا احترام اور محبت تھی۔

چنانچہ ایک سابق ممبر پارلیمنٹ ٹھاکروجے پال سنگھ (۱) نے بھی مجھے ایک بار بتایا تھا کہ علامہ رفیق صاحب کو پارلیمینٹ کا ٹکٹ مل رہا تھا۔ میں نے بہت کہا کہ آپ الیکشن لڑیں ہندوراجپوت بھی سب آپ کے ساتھ ہیں ان کا بھی دل چاہ رہا تھا اور وہ بالکل تیار تھے۔ لیکن پھر مدرسہ کی وجہ سے ٹکٹ نہیں لیا۔ بہرحال وہ دب کر گھٹ کر بے بسی کی زندگی بسر کرنے کے قائل نہ تھے اور ہمیشہ کچھ کر دکھانے کے عزم سے چور رہتے تھے۔ وہ اپنے متعلقین اور شاگردوں کو بھی یہی سکھاتے اور بتاتے تھے کہ:

خاموش مزاجی تمہیں جینے نہیں دے گی
اس دور میں جینا ہے تو کہرام مچادو

(۱) ٹھاکر صاحب موضع براَل ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے اور چودھری چرن سنگھ (سابق وزیراعظم ہند) کو الیکشن میں شکست دے کر پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ بہت صاف گو، بڑے نستعلیق اور خوش مزاج آدمی تھے۔ ۱۹۹۷ء میں انتقال ہوا۔

اگرچہ ان کے وسائل اور حالات کبھی ان کے عزائم کے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکے، لیکن ان کا حوصلہ ان کے جسم کی طرح آخر تک جوان رہا۔

جدید تعلیم سے متعلق خیالات

وہ جدید تعلیم کے بھی حامی تھے، اور چاہتے تھے کہ مسلم بچے اپنے ایمان وتہذیب کی حفاظت کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عصری علوم اور جدید ٹکنالوجی حاصل کریں۔ چنانچہ جب کسی ایسے نوجوان کو دیکھتے جو عصری تعلیم گاہوں سے فیض یافتہ اور جدید علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کا پابند اور متبع شریعت ہوتو ان کا چہرہ کھل اٹھتا، وہ بہت خوش ہوتے۔ اور ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان کے اندر بے دینی یا دین بیزاری کے جذبات جدید تعلیم سے نہیں۔ بلکہ غلط ماحول سے پیدا ہوتے ہیں۔

اگر کالج میں پڑھنے والے طلباء کو دیندار والدین کی صحیح سرپرستی اور نگرانی حاصل رہے۔ یا علماء حق سے ان کا تعلق رہے، تو بڑی حد تک غلط ماحول کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مسلم بچوں کی جدید تعلیم کے لئے اپنے ادارے قائم کریں، جس کی دیکھ بھال خود ان کے ہاتھ میں ہو اور ان میں ایسا ماحول بنایا جائے کہ طلباء دین سے اور علماء دین سے وابستہ رہیں اور جدید تعلیم بھی حاصل کرسکیں۔ اس سلسلہ میں وہ جنوبی ہند کی مثال پیش کرتے تھے۔ جہاں پر اس طرح کے تعلیمی ادارے بہت خوبی اور کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

تنگ نظری کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں

وہ ایسے علماء سے اختلاف رکھتے تھے جو صرف مسجد کے حجروں اور مدرسوں کی چہار دیواری پر قناعت کر کے دیگر تمام علوم وفنون اور مناصب کو غیروں کا حق

سمجھتے ہیں۔ اور مسلمان بچوں کے ذہنوں کو بھی اسی غلط نظریہ پر ڈھالنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اندر احساس کمتری کا زہر گھول رہے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا کہ ہم نے تمہیں:

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاٰخرة حسنة

سکھایا تھا اور تم نے دنیا کی ساری حسنات (جس میں نیکیوں کے ساتھ اللہ کی بخشی ہوئی تمام جائز نعمتیں اور عزت وحکومت، جائز منفعت ذرائع ترقی کے ساتھ جملہ علوم وفنون بھی شامل ہیں) کو غیروں کا مال سمجھ کر ہمارے قرآن کی توہین کی ہم نے جیسے آیت اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) نازل فرمائی تھی ایسے ہی آیت: واعدو لهم ماستطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو اللّٰه وعدوكم، الخ۔ (اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے ان کو اللہ ہی جانتا ہے۔ سورۃ انفال آیت ٦٠) بھی نازل فرمائی تھی۔

تم نے ایک آیت کو یاد رکھا اور دوسری کو دانستہ نظر انداز کر دیا، حالانکہ جیسے اقیموا الصلوٰۃ واجب العمل ہے ایسے ہی واعدوا لہم۔ الخ بھی واجب العمل ہے اور جیسے اقیموا الصلوٰۃ منسوخ نہیں اسی طرح واعدو لہم، الخ بھی منسوخ نہیں ہے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر اس طرح کا ادھورا اسلام پیش کرتا ہے تو وہ اللہ کی کتاب کے ساتھ خیانت کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہا ہے جو اللہ کے غضب کا موجب ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

" افتؤمنون ببعض الكتاب و تكفرون ببعض فما جزاء من

يفعل ذلك منكم الاخزىٰ فى الحياة الدنيا ويوم القيامة يردون الىٰ اشد العذاب۔"

"تو کتاب کے بعض پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے ہو۔ سو اور کیا سزا ہو ایسے شخص کی، جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے، بجز رسوائی کے دنیاوی زندگانی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے"۔ (البقرہ آیت: ۸۵)

بیشک دینی علوم مسلمانوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں لیکن دائرۂ اسلام میں رہتے ہوئے دنیا بھر کے مختلف علوم وفنون حاصل کو کرنا بلکہ ان میں اپنی برتری ثابت کر کے اپنی بالا دستی قائم کرنا بھی اسلام کی ہی تعلیم ہے اور قرونِ اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے اس تعلیم پر پوری طرح عمل کر کے دکھایا، جس کی وجہ سے وہ دین ودنیا میں سر بلند وسرخرو رہے اور بعد میں جب مسلمانوں نے اس طرف سے غفلت برتی ان کے اندر سہل انگاری اور تنگ نظری آ گئی اور وہ اغیار کی سازش کا شکار ہو کر اپنے کتب خانے ان کے سپرد کر کے گوشۂ عزلت میں بیٹھ گئے۔ تو دنیاوی علوم وفنون کا تاج اور مسند حکومت وسلطنت ان سے چھین کر ان لوگوں کے سپرد کر دی گئی جنہوں نے اللہ کی اس نعمت کی قدر کرتے ہوئے اس کو سینے سے لگایا اور جنہوں نے اس نعمت کی ناقدری کی اصولِ خداوندی کے مطابق ذلت وغلامی کا عذابِ شدید ان پر مسلط کر دیا گیا"۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

مسلمانوں کی ایک بدقسمتی

ہمارے اکابر نے قرآن وحدیث کے علوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کائنات کے جس علم (سائنس وریاضی وغیرہ) کی بنیاد ڈالی اور اس کو نئی جہت، نئی

زبان اور کمال وعروج عطا کیا تھا نیز اپنی زندگی قربان کر کے سینکڑوں رہنما کتابیں تصنیف کر ڈالی تھیں ۔ جو بعد کی نسلوں کے لئے مستند مراجع وماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، افسوس کہ ان بزرگوں کے نام لیوا ان کتابوں کے نام تک بھول گئے اور وہ سارے کتب خانے اس طرح فرنگیوں کی نذر کردیئے گویا وہ انہیں کی امانت تھی، اقبال نے اس تاریخی المیہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شئے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اگر اس کو ایک تاریخی المیہ سمجھ کر تدارک مافات کی کوشش کیجاتی تو حالات اتنے سنگین نہ ہوتے ۔لیکن کچھ لوگوں نے آیات قرآنی پر نہ تو خود عمل کرنے کی کوشش کی اور نہ عام مسلمانوں کو اس کے مفہوم ومقصد سے آگاہ کیا۔ بلکہ اس طرف توجہ دلانے والوں کی مخالفت کرنے کو ایک دینی فریضہ کے طور پر ادا کرتے رہے، مسلمانوں کو اپنی مرضی کے دائرہ پر گھماتے رہے اور اپنی سمجھ کے اسلام پر اصرار کرتے رہے۔ان کی اس مجرمانہ حرکت سے اسلام کا تو خیر کیا بگڑ سکتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔

مدارس کے ساتھ جدید تعلیم گاہوں، ہسپتالوں اور درالقضاء کی ضرورت

علامہ صاحب کا خیال تھا اور جہاں تک ان کی آواز پہنچ سکتی تھی وہ پکار پکار کر کہتے تھے کہ ہمیں جس طرح مسجد کے محرابوں اور مدرسوں کی درسگاہوں کی ضرورت ہے اسی طرح جدید تعلیم گاہوں اور عصری درسگاہوں کی بھی ضرورت

ہے۔ اعلیٰ درجہ کے ہسپتالوں اور دار القضاء کا قیام بھی مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔

جماعت عادلہ اور شرعی پنچایت

علامہ صاحب نے مسلمانوں کے اندر سے غیر شرعی رسوم کو منظم طریقے پر ختم کرانے اور باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے ''جماعت عادلہ'' کے نام سے ایک اصلاحی تنظیم قائم کی، جس کے ذریعہ ایک بڑے طبقہ کے اندر سے بالخصوص شادی بیاہ میں لازمی سمجھی جانے والی بہت سی بے ہودہ رسوم کا خاتمہ ہوا۔ انھوں نے ''شرعی پنچایت'' کے ذریعہ مسلمانوں کے سینکڑوں تنازعات کو باہمی افہام وتفہیم، مصالحت اور شرعی احکام کے ذریعہ حل کرا کے مسلمانوں کو سرکاری عدالت وکچہری کے ذلت بھرے راستوں سے نجات پانے کا راستہ دکھایا۔

وہ مسلمانوں میں اسلامی غیرت دیکھنا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان دوسروں کے دروازوں پر نہ تو تعلیم کی بھیک مانگنے جائیں، نہ انصاف کی۔ اور نہ وہ علاج ومعالجہ کے سلسلہ میں دوسروں کے دست نگر ہوں، مسلمانوں کے پاس ہندوستان میں حکومت نہ سہی، لیکن اگر اسلامی غیرت ہو اور حوصلہ اور جرأت کے ساتھ خود کفیل ہونے کی ہمت کریں۔ تو جیسے مسلمان اپنی مسجدوں اور مدرسوں میں خود کفیل ہیں، کسی حکومت اور ہندو یا عیسائی تنظیم کے مرہون منت نہیں۔ اسی طرح جدید تعلیم گاہیں عمدہ ہسپتال اور دار القضاء وغیرہ اور دیگر رفاہی ادارے بھی قائم کر کے عزت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں اور خود فائدہ اٹھانے کے ساتھ دیگر اہل وطن کے لئے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔

انھوں نے مظفر نگر میں ایک دار القضاء قائم بھی کیا ہوا تھا، جو ایک محدود انداز میں اب بھی چل رہا ہے۔ وہ اپنی تقریروں میں بڑے دکھ کے ساتھ فرماتے تھے

کہ کتنا بے غیرت ہے وہ مسلمان بھی جو دوسروں کے دروازوں پر انصاف کی بھیک مانگنے جاتا ہے اور قرآن وحدیث کا فیصلہ اسے منظور نہیں۔

مدارس کے طلباء کو ہندی، انگریزی کی ضرورت

ایک دفعہ ایک مدرسہ کے جلسہ میں صبح کے وقت علامہ صاحب کے پاس کچھ مدارس کے ذمہ دار علماء بیٹھے ہوئے تھے۔ بات یہ چل رہی تھی کہ مدارس کے اندر کم از کم بقدر ضرورت انگریزی اور ہندی کی تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہئے۔ جس مدرسہ میں یہ جلسہ تھا اتفاق سے اس کے مہتمم صاحب ہندی، انگریزی کے سخت مخالف اور موجودہ حالات اور تعلیمی ضروریات سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ حافظ تھے اور واجبی سی اردو جانتے تھے، بس۔

ان مہتمم صاحب کے کانوں میں جب یہ باتیں پڑیں تو انہیں سخت تشویش لاحق ہوگئی۔ خدا جانے ان کو یہ وہم ہوا کہ میرے ہی مدرسہ کے بارے میں کوئی سازش کی جارہی ہے۔ یا وہ اس قسم کی گفتگو کو سرے سے ہی مضر سمجھتے تھے۔ وہ جلدی جلدی گئے اور ایک کتاب اٹھا کر لائے، جس میں انہیں جیسے کسی صاحب نے انگریزی کی مخالفت میں کچھ لکھ رکھا تھا۔ انہوں نے وہ کتاب کھول کر علامہ صاحب کے سامنے رکھدی اور گویا اپنی دانست میں حجت تمام کردی۔ حضرت علامہ صاحب نے وہ تحریر بلند آواز سے پڑھی، تاکہ سب سن لیں اور پھر ناگواری کے لہجے میں فرمایا کہ ”حافظ صاحب! یہ سب میرا پڑھا ہوا ہے۔ میں نے یہ سب پڑھ رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں کی ضرورت ہے“۔

اتفاق سے کالج میں پڑھنے والا ایک صالح نوجوان بھی اس وقت وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ علامہ صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھئے یہ لڑکا ہے، نیک اور دیندار ہے۔ اس کی کوئی نماز نہیں چھوٹتی، تہجد بھی پڑھتا ہے۔ کالج

میں پڑھتے ہوئے جب ایک لڑکا ایسا ہو سکتا ہے تو اگر مدرسہ کے خالص دینی ماحول میں رہتے ہوئے ہمارے طلباء انگریزی اور ہندی زبان سیکھنے کے لئے چند کتابیں پڑھ لیں گے تو کیا ان کا ایمان خطرہ میں پڑ جائے گا؟

آپ جس دور میں جن حالات میں رہ رہے ہیں، ان کو سمجھئے! اس تنگ نظری سے کام نہیں چلے گا۔

حضرت علامہ صاحبؒ سے ایک یادگار مکاتبت

حضرت علامہ صاحب کے ذہن میں قوم وملت کے لئے منظّم طریقہ پر ٹھوس اور دوررس نتائج کی حامل خدمات کا ایک مفصل منصوبہ تھا اور ان کے دل میں اس کے لئے ایک پرخلوص جذبہ موجود تھا ان سے گفتگو کرنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے عزائم واضح طور پر کچھ بڑا کام کرنے کے تھے لیکن حالات اور وسائل نے موافقت نہ کی۔

میں کبھی کبھی ملی مسائل پر ان سے گفتگو اور مشورے کرتا تو ان کی تڑپ اور جذبہ سے بہت متاثر ہوتا۔ اسی فکری مناسبت کی بناء پر جو کچھ جذبات میں اپنے اندر محسوس کرتا وہ حضرت علامہ صاحب سے کبھی زبانی اور کبھی تحریری طور پر عرض کرتا رہتا تھا۔

حضرت علامہ صاحب کا یہ مکتوب گرامی اس وقت کی یادگار ہے جب راقم الحروف کا قیام عرب ملک دوحہ قطر میں تھا، جیسا کہ ان کے دست مبارک سے لکھی ہوئی پتہ کی عبارت سے ظاہر ہے۔ وہیں سے میں نے علامہ صاحب کے نام ایک تفصیلی خط کے اندر اپنے کچھ احساسات اور منصوبے نیز منظّم طور پر کام ہونے کی ضرورت سے متعلق تحریر کیا، یہ فُل اسکیپ کے غالباً چار صفحات پر مشتمل ایک طویل خط تھا جس کی کوئی نقل تو اب میرے پاس نہیں ہے، البتہ سنجیدہ منصوبوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ جذبات سے بھرپور اپنے اس خط کے یہ الفاظ

ابھی تک مجھے یاد ہیں کہ:

”میرا دل چاہتا ہے کہ محمد بن قاسم کے جانشینوں کی رگوں میں خون کی جگہ آگ بھردوں، تا کہ وہ افسردگی اور بے عملی کی زندگی کو ٹھکرا کر ایک صالح انقلاب کے نقیب بن جائیں میں اپنی قوم کے ایک ایک نوجوان کو سمجھاؤں کہ:

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

پورا خط اسی انداز پر تھا اور میرا یہ خط گویا ان کے من کی آواز تھی جس نے میرے قلم کے ذریعہ باہر آکر علامہ صاحب کے جذبات میں ایک ہیجان سا برپا کردیا۔ دل میں دبی اور سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکا دیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں حضرت علامہ صاحب نے جو خط مجھے تحریر فرمایا وہ ان کی زندگی کے اہم ترین مکتوبات میں سے ایک اہم خط ہے اور یہ خط اس حقیقت کا عکاس ہے کہ ان کے دل میں منظّم طور پر کام کرنے کے مخلصانہ جذبات کے ساتھ ان کے ذہن میں اس کا تفصیلی خاکہ بھی موجود تھا، جو بعض غیر اختیاری موانع کے باعث انجام نہ پاسکا۔

یہاں پر اس خادم کے نام حضرت علامہ صاحب کا مذکورہ خط جوں کا توں نقل کیا جاتا ہے۔ پہلے خط کا عنوان دیکھئے پھر اصل خط ملاحظہ فرمائیے۔

(عزیز القدر مولانا ممشاد علی صاحب رفع اللہ درجاتہ ص،ب ۱۱۸۲ دوحہ قطر)

حضرت علامہ صاحبؒ کا ایک اہم خط

باسمہٖ تعالیٰ

از رفیق احمد جامعہ اسلامیہ بھیسانی اسلام پور ضلع مظفر نگر یوپی (انڈیا)

۱۱/۶/۱۴۰۴ھ مطابق ۵/۸/۱۹۸۴ء

عزیز القدر قرۃ العین سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

طبیعت خدا کرے کہ اچھی ہو، بندہ بعافیت ہے اور تمام حالات لائق صد شکر ہیں۔ مفصل مکتوب جذبات سے مملو و مشحون ملا۔ دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ امید کی

کرن نظر آئی کہ شاید اتنی دیرینہ تمنا آپ کے ہاتھوں پوری ہوگی۔اس انتظار میں رہا کہ چند لمحات قدرے سکون وفرصت کے ہاتھ لگ جائیں تو ذرا تفصیل سے لکھوں مگر یہ ممکن نہ ہوا تو بھاگتے دوڑتے ہی آج چند جملے لکھنے کی سوچی۔اول تو دل سے دعاء ہے اللہ تعالیٰ جلد سے جلد تمام جذبات کو ملکات اور پھر عزائم اور اعمال بنادیں تاکہ ثمرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

عزیز من، کسی بھی عمل سے پہلے ذہن کو صدق واخلاص کی دولت سے مالا مال ہونا ضروری ہے سو الحمدللہ بندہ اس مرحلہ میں مطمئن ہے اور جناب والا کے صدق واخلاص پر پورا یقین واعتماد ہے۔

دوسرا نمبر عزم وہمت کا ہے جناب والا کا مکتوب گرامی الحمدللہ اس کا ترجمان ہے تیسرا نمبر اسباب ووسائل کا ہے وہ بھی بحمداللہ کل نہ سہی کچھ نہ کچھ حاصل ومیسر ہیں۔چوتھا نمبر چند احباب مخلصین کا جو کہ وحدت فکر کے حامل ہوں فراہم ہوجانا ہے۔ اگرچہ اس دور میں یہ عنقاء ہے مگر ناممکن نہیں۔

پانچواں نمبر ایک قائد اور رہبر کامل کی صحیح سرپرستی اور رہنمائی کا ہے یہ بھی اگرچہ نایاب ہے مگر امت خالی نہیں ''جوئندہ یابندہ''

(۶) ایک مرکزی مقام جو کہ ہر طرح اپنا ہو اور اس کا بست وکشاد صرف اپنے ہاتھ میں ہو اگر حاصل نہ ہو تو حاصل کیا جانا یا خود تیار کرلینا آپ کے لئے زیادہ مشکل نہیں۔

(۷) وقت اور فرصت ہی نہیں بلکہ اسی کام کے لئے کلی فراغت ہو اور جنون کی حد تک اس میں مشغولی ہو،اس درجہ کہ دیکھنے والے دیوانہ اور مجنون بتلانے لگیں۔ ملازمت، تجارت یا زراعت اور صنعت وحرفت کی مشغولی ہوتے ہوئے اس امر مہتم بالشان کی تکمیل تو بڑی چیز ہے،بسم اللہ بھی مشکل ہے۔

(۸) کم از کم قائد کا فارغ البال ہونا بھی ضروری ہے اور توکل کی شان علی وجہ الکمال واہتمام ضروری ہے۔

(۹) مخلصین کی جماعت کم از کم ۱۴ نفر پر مشتمل ضروری ہے اگرچہ روز اول اس کی ضرورت نہیں۔ایک اکیلا بھی اگر سربکفن دیوانہ وار کھڑا ہو جائے تو چند لمحوں میں قافلہ تیار ملے گا۔

(۱۰) ترک جلال آباد کے بعد بندہ سوچتا رہا کہ کام ہو مگر خود ہی نہ ہوسکا اور ساتھی بھی نہ ملا،امید کرتا ہوں کہ آں عزیز شاید کام آجائیں یا پھر کام لے لیں۔

اے کاش! اس وقت بندہ کی عمر تیس سال ہوتی۔اچھا خدا حافظ۔

عکس تحریر حضرت علامہ رفیق احمد صاحب علیہ الرحمۃ

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۲۳۷۷۷

عزیز القدر قرۃ العین سلمہ اللہ الملوک السلام [illegible]

طبیعت خدا کرے کہ اچھی ہو رہی ہو۔ کیا کیفیت ہے اور تمام حالات [illegible] مفصل لکھو۔ جذبات سے مملو [illegible] دل خوشی ہوا [illegible] اچھے لگا [illegible] [illegible] تمنا آپ کے شعور پوری ہو گی اس کی انتظار میں [illegible] [illegible] فرصت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اول تو دل سے دعا ہے اللہ کرے جلد سے جلد تمام جذبات کو [illegible] [illegible] اعمال بنا دیں تاکہ ثمرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں [illegible] صدق و اخلاص کی دولت [illegible] ضروری ہے [illegible] الحمد للہ [illegible] اس مرحلہ میں [illegible] صدق و اخلاص [illegible] نور التحقیق و اعتماد ہے دوسرا [illegible] کا ہے [illegible] [illegible] تیسرا [illegible] اسباب و وسائل کا ہے وہ بھی [illegible] [illegible] [illegible] حاصل [illegible] [illegible] [illegible] حاصل ہوں [illegible] اس دور میں [illegible] [illegible] [illegible] صحیح [illegible]

اگرچہ نایاب ہے مگر دوست قالی نسخہ سے حج شدہ یا شدہ۔

۶۔ ایک بزرگ کا مقام جو آپ ہر طرح وثیقہ پر اور اسکا مست وقت درخواست

یہ اگر حاصل کر لو تو حاصل کیا جا سکا یا خود شیاد کر لیا آپ نے زیادہ

۷۔ وقت اور فرصت ہی نہیں بلکہ اسی کام کی تہ کے کلی فراغت ہر اور ہنوز کی

حالانکہ اس میں مشغولی ہو ہم اس وجہ کہ دیکھنے والے دیکھ رہے اور ہر قسم کی

ملازمت یا تجارت یا زراعت اور صنعت و حرفت کی مشغول ہو کر

اس ورد میں مشغول ہو کر ان کی تکمیل کرنی ہی ضروری ہے بس اللہ ہی مشکل ہے۔

۸۔ مجموعہ تاریخ کا تاریخ الکبیر یا یہ ضروری ہے اور شوق کی کا شاں

علی قبض الکمال و اتمام ضروری ہے۔

۹۔ مختصر کی علامت تم نے ۱۵ نمبر پر شامل ضروری ہے اگرچہ روز اول اسکی

آپ کی امید ہے اگر مسئلہ کی دیکھا اور ... ہو گا تو ... فاضل ...

... اگر مسئول اللہ ... کام ... خود ... اسکا ... بھی

امید ہے کہ ... کام ... یا ... کام ... کوشش ... شدہ کی

عمر ۳۲ سال ہو گئی اچھا خدا حافظ

مشعلِ راہ

میں ان دنوں ملک سے باہر مقیم تھا اس لئے چاہت کے باوجود عملی طور پر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور جب ملک میں رہائش کا ارادہ ہوا تو اس سے پہلے ہی حضرت علامہ رفیق احمد صاحب اپنے رفیق اعلیٰ کے حضور میں جا چکے تھے۔

بہر حال، اس خط کے مندرجات ملت کی خاطر کام کرنے والے ہر فرد کے لئے مشعل راہ کی حیثیت سے راہ نما خطوط مہیا کرتے ہیں اور جو بھی چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور سے انسیت

جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور میں وہ اکثر تشریف لاتے رہتے تھے۔ایک دفعہ ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے دن تھے علامہ صاحب تشریف لائے لیکن یہاں کوئی نہیں ملا، پھر بھی مسجد کی طرف والے احاطے میں خاصی دیر تک بیٹھ کر تشریف لے گئے۔

اگلی بار آنا ہوا تو فرمایا کہ آپ نے یہاں یہ پھلواریاں ایسی لگوا رکھی ہیں کہ آدمی اگر اکیلا بھی آ کر بیٹھ جائے تو اس کو تنہائی محسوس نہیں ہوتی یہ پھول بھی آدمیوں کا ہی کام دیتے ہیں۔

ان کو یہاں سے بہت دلچسپی تھی، ہر بات کو بڑے اہتمام سے دیکھتے اور سنتے اور بہت اپنائیت کے ساتھ مشورہ دیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک بار وہ تشریف لائے تو جہاں آج فلاح دارین اسلامیہ انٹر کالج کی عمارت کھڑی ہے اس زمین میں لپٹس کے بہت سارے درخت تھے اس وقت تک صرف مدرسہ کی مرکزی عمارت ہی بنی تھی انہوں نے عمارت کو دیکھنے کے بعد میرے ساتھ کھیت اور درختوں میں بے تکلف چلتے ہوئے جامعہ کی پوری زمین کا چکر لگایا، میں ان کو اپنے ذہنی خاکے اور منصوبوں کے مطابق بتاتا جا رہا تھا

کہ یہاں ہسپتال بنانا ہے، اس جگہ انٹر کالج کی تعمیر کا ارادہ ہے وغیرہ۔

وہ پوری زمین پر گھوم پھر کر جامعہ کے صدر دروازہ کے سامنے اندر کی طرف کھڑے ہوگئے۔ وہاں کھڑے کھڑے یونہی باتوں باتوں میں ہنستے ہوئے میں نے عرض کیا کہ حضرت! میرا کوئی بھی منصوبہ شیخ چلّی سے کم نہیں، علامہ صاحب میری بات پر مسکرائے۔ شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سنجیدہ ہوکر فرمایا کہ ''اب تک کی آپ کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ آپ آئندہ بھی اپنے تمام منصوبوں میں کامیاب ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ حضرت علامہ صاحب کی روح کو شاد فرمائے کہ ان میں سے بعض منصوبے مکمل ہو چکے ہیں اور بعض کی تکمیل و ترقی کی کوشش جاری ہے یعنی عروس فکر اب عملی گرفت میں ہے۔

محبت و عنایت کے پھول

ایک دفعہ بلاسپور غریب خانہ پر تشریف لائے مفتی محمد فاروق صاحب (مہتمم جامعہ محمودیہ میرٹھ) ساتھ تھے رات میں بھی قیام رہا، عشاء کے بعد دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہم تینوں ہی تھے کہ کچھ دیر کے بعد مفتی صاحب سے بھی (غالباً ان کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے) فرمایا کہ آپ سو جایئے ہم تو آج باتیں کرنے کے لئے ہی آئے ہیں۔ رات میں تقریباً دو بجے تک باتیں کرتے رہے۔ حالات پوچھتے اور سنتے رہے اور مشوروں سے نوازتے رہے۔

اس ناکارہ میں بے شمار برائیوں کے ساتھ ایک دو اچھی عادتیں بھی ہیں، اور ان میں سے ایک یہ کہ زمانۂ طالب علمی سے ہی اکابر اہل اللہ سے تعلق رہا، ان کی ہدایات و مشوروں کو ہمیشہ عظمت واحترام کے ساتھ دل میں بٹھایا اور ان کی جو تحریریں اور خطوط میرے نام آئے ان کو قیمتی سرمایہ کے طور پر محفوظ رکھتا ہوں،

جن کا مطالعہ دل کی افسردگی و بیزاری کے زبردست روحانی مسرت اور اخلاقی طاقت فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ اکابر کے یادگاری خطوط کے میرے اس ''انمول ذخیرہ'' میں حضرت علامہ صاحب کے بھی متعدد خطوط محفوظ ہیں۔ ان کے مکتوبات میں ہدایات ونصائح بھی ہیں اور بعض امور پر تنبیہ بھی، بے شمار دعائیں اور حوصلہ افزائی کے کلمات بھی ہیں اور محبت وعنایت کے سدا بہار مہکتے ہوئے پھول بھی، وہ پھول جو کبھی مرجھاتے نہیں، بلکہ وقت کے ساتھ ان کی قدر و قیمت اور خوشبو کی مستی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

میں نے آنکھوں پہ لے لیا اس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا

میں اپنے دل کی باتیں بڑی بے تکلفی سے ان کی خدمت میں لکھ بھیجتا تھا اور وہ پوری سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ ان کا جواب تحریر فرماتے تھے۔

ایک بار میرے خط کا جواب لکھنے میں حضرت علامہ صاحبؒ کو عدم الفرصتی کے باعث تاخیر ہوگئی تو میں نے دوسرے خط میں عرض کیا کہ آنجناب غالبًا مجھ سے ناراض ہیں، اس کے جواب میں ایک تفصیلی شفقت بھرا مکتوب ملا، جس میں بہت سی حوصلہ افزائی کی باتیں لکھنے کے بعد آخر میں تحریر فرمایا:

''بندہ کے دل ودماغ پر آں عزیز کی محبت اور اخلاص کی مہر بہت پہلے سے ثبت ہے، اس میں انشاء اللہ سر مو بھی فرق نہ آئے گا، آپ تو بندہ کے لئے سرمایۂ سعادت وآخرت ہیں۔ اب آپ تشریف لائیں تفصیلات زبانی ہونگی۔''

وہ بلاسپور جامعہ میں اور غریب خانہ پر اکثر تشریف لاتے رہتے تھے اور اس ناکارہ کے ساتھ ان کی شفقت واپنائیت کے بہت واقعات ہیں۔ جو زیادہ ترجی

نوعیت کے ہیں اور میں تحریر میں ان کا ذکر اس لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ شفقت وعنایت کے کچھ پھول صرف اپنے لئے بھی رکھ لینے چاہئے۔

دارالعلوم (وقف) دیوبند میں درس حدیث

دارالعلوم سے حضرت مہتمم صاحبؒ (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی علیحدگی کے بعد جب دارالعلوم (وقف) دیوبند کا قیام ہوا تو حضرت مہتمم صاحبؒ نے وہاں درس حدیث کی ذمہ داری علامہ رفیق احمد صاحبؒ کے سپرد فرمائی، جو حضرت مہتمم صاحبؒ سے تعلق کی بناء پر آپ نے بخوبی انجام دی، اور دو سال تک دارالعلوم (وقف) دیوبند میں بخاری شریف کا درس دیا۔ اس کے بعد جب وہاں کام کچھ جم گیا تو واپس بھیسانی آ کر وہاں مدرسہ میں تعلیم جاری رکھی اور دیوبند بھی آنا جانا رہا۔

بھیسانی میں دورۂ حدیث شریف تو باقاعدگی سے نہیں ہو پایا۔ کسی سال دورۂ حدیث شریف کی جماعت ہوتی تھی، کسی سال نہیں۔ البتہ عربی کی دوسری جماعتوں کی تعلیم ہوتی رہی۔

مظاہر علوم (وقف) میں تدریسی خدمات

۱۹۸۷ء میں حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم ناظم مظاہر علوم (وقف) سہارنپور کی فرمائش پر مظاہر علوم میں تشریف لے گئے اور وہاں پر بخاری شریف اور حدیث کی بعض دیگر کتابوں کی تدریس کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے۔ اس طرح عمر کے آخری تین سال مظاہر علوم میں گذارے اور پھر وہیں سے یہ عاشق حدیث، سب کا ہمدرد و رفیق خاموشی کے ساتھ اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس چلا گیا اور ہزاروں طلباء، علماء اور عوام وخواص کے دلوں پر اپنی شفقت وعنایت، رفاقت ومحبت اور ہمدردی وغمگساری کے انمٹ

نقوش چھوڑ گیا۔

اے اہل عشق مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لیکے زمانہ اگر پھرے

حضرت علامہ رفیق احمد صاحبؒ، رفیق اعلیٰ کے حضور میں

۱۹۹۰ء کی بات ہے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں ان دنوں دوحہ، قطر میں مقیم تھا اور وہاں سے چھٹی آیا تھا۔ دہلی ہمارا جہاز شام کے وقت پہنچا، اس وقت ملک کے حالات بہت خراب تھے کیونکہ لال کرشن اڈوانی (موجودہ وزیر داخلہ ہند) نے رام مندر کے لئے اجودھیا کی رتھ یاترا سے پورے ملک میں آگ لگا رکھی تھی۔ انتہائی کشیدگی اور نفرت کا ماحول تھا۔ کسی مسلمان کے لئے سفر کرنا سخت دشوار بنا ہوا تھا، اور یوپی کے تقریباً تمام شہروں میں کرفیو لگا ہوا تھا ہمیں دہلی آ کر معلوم ہوا کہ مظفر نگر میں بھی سخت کرفیو نافذ ہے۔ اس لئے رات میں وہاں جانا خطرناک ہے۔ ہم رات کو دہلی میں ہی ٹھہر گئے۔ عشاء کے بعد کھانا کھاتے ہوئے دہلی کے ہمارے ایک دوست نے مجھ سے کہا:

آپ کو علامہ رفیق احمد صاحب کے بارے میں تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا؟

میں نے پوچھا کیا ہوا؟

''ان کا انتقال ہو گیا ہے۔'' انا للہ وانا الیہ راجعون

لقمہ گویا حلق میں پھنس گیا تھا اور میں حیرت سے انکے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

چند لمحوں میں ہی حضرت علامہ صاحبؒ سے وابستہ بے شمار یادیں ذہن کے پردے پر تیزی سے گھوم گئیں اور دستر خوان سے ہٹتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں میری زبان سے نکلا کہ:

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

آخری وقت

بعد میں متعلقین سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت علامہ صاحبؒ رات میں بھیسانی مدرسہ کے صحن میں اکیلے ہی لیٹے ہوئے تھے کہ سر میں درد ہوا۔ اور اچانک اتنا شدید ہوا کہ ان کی چیخ نکل گئی۔ یہ چیخ سن کر متعلقین دوڑے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بلوایا گیا۔ دوائیاں دی گئیں، لیکن افاقہ نہ ہوا، درد کی شدت سے تھوڑی دیر بعد ہی بے ہوش ہو گئے، اسی وقت تھانہ بھون اور پھر سہارنپور لے جایا گیا، سہارنپور ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ لیکن بے ہوشی مسلسل رہی اور اسی بے ہوشی کی حالت میں ۱۶؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ ۶؍اکتوبر ۱۹۹۰ء بروز شنبہ تقریباً بارہ بجے دن کو سہارنپور ہسپتال میں ہی روح پرواز کر گئی۔ اس وقت مولوی محمد مصطفیٰ اور مولوی محمد مستقیم صاحبان پاس بیٹھے ہوئے تھے، دیگر اعزہ و متعلقین بھی ہسپتال میں موجود تھے۔ مظاہر علوم میں نماز جنازہ حضرت مفتی مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم نے پڑھائی۔

آخری آرام گاہ

اس کے بعد جنازہ کو بھیسانی لایا گیا اور وہاں بھی نماز جنازہ ہوئی۔ بھیسانی مدرسہ کے ہی ایک عقبی گوشہ میں آخری آرام گاہ ہے۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے میں بھیسانی حضرت علامہ صاحبؒ کے پاس حاضر ہوا تھا تو انھوں نے مجھے اس مدرسہ کی عمارت میں گھمایا جہاں آج ان کی قبر ہے، چاروں طرف گھوم کر جب اس جگہ پہنچے جہاں حافظ عبدالرازق صاحب بانی مدرسہ کی قبر ہے تو علامہ صاحب نے حافظ صاحب مرحوم کا تعارف کرایا ان کی قبر دکھائی اور اس قبر کے برابر والی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "یہ ہمارے لئے ہے"۔

انتقال کے بعد جب علامہ صاحب کی قبر پر حاضری ہوئی تو وہ پورا واقعہ

ذہن میں گھوم گیا، آنکھیں اشکبار ہوگئیں، کبھی اپنی کم نصیبی کا خیال آتا کہ ہمدرد اور مشفق و مخلص سرپرست سے محروم ہوگیا۔ کبھی علامہ صاحب کے اس انتخاب کی مقبولیت پر حیرت ہوتی کہ اتنی جلدی.........

اور ساتھ ہی زمین کے اس ٹکڑے کی رفعت پر بھی رشک آتا جس میں یہ گنجینۂ علم اور خزینۂ حدیث دفن ہے۔

حضرت علامہ صاحب کو اپنی والدہ سے بہت انسیت تھی اور والدہ کی قبر کھیت میں بستی سے باہر ہے۔ بعض متعلقین نے بتایا کہ علامہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی ہمیں بھی یہیں لاکر والدہ کے برابر میں دفن کردینا'' معلوم ہوا کہ وہاں علامہ صاحب کی قبر بھی تیار ہوگئی تھی اور وہیں دفن کرنے کا مشورہ تھا۔ لیکن مدرسہ والی زمین کی قسمت بلند ہوئی اور علم حدیث کا یہ گوہر آخر اسی کے حصہ میں آیا۔

مجھے ماں کے برابر میں دفن ہونے کی علامہ صاحب کی خواہش کا علم نہ تھا اور نہ مجھے اس تفصیل کا علم تھا کہ وہاں قبر بھی تیار ہوچکی تھی۔ پھر بعض حضرات کے مشورہ سے مدرسہ میں قبر تیار کی گئی۔ اس لئے جب میں نے علامہ صاحب کے متعلقین کو بتایا کہ حضرت کی اسی جگہ دفن ہونے کی خواہش تھی جہاں آج ان کا مدفن ہے، اور مجھ سے ایک دفعہ اس طرح فرمایا تھا، تو ان کے لئے یہ ایک دلچسپ انکشاف تھا۔

اس کے بعد انہوں نے مذکورہ بالا تفصیل مجھے بتائی کہ کس طرح دوسری جگہ قبر تیار ہونے کے باوجود پھر یہاں مدرسہ میں دفن ہوئے۔

مبارک ہو اے قبر کی زمین! کہ حدیث پاک کی برکت سے تیرا مرتبہ بھی بلند ہوگیا۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے کرم سے یوں ہی اچانک بلند کردیتا ہے۔

مسلم راجپوتوں کا رہ نما

حضرت علامہ صاحب کی شخصیت یوں تو کسی فرد یا برادری کے لئے مخصوص

نہ تھی۔ ان کے علم وکمال کا فیض عام تھا۔ جو علاقائی یا ملکی سرحدوں میں محدود نہ تھا۔ بلکہ ملک سے باہر بھی جاری رہا، لیکن مسلم راجپوت برادری کیلئے تو انکی شخصیت مرکزی حیثیت کی حامل تھی۔ بستی بستی جاکر انہوں نے مدارس اور مکاتب قائم کئے، جن کی بدولت ہزاروں بچوں کا مستقبل روشن ہوا۔ دینی امور میں رہبری کے ساتھ لوگوں کے دنیوی معاملات میں بھی وہ پوری ہمدردی اور دلچسپی کیساتھ ان کی رہ نمائی فرماتے تھے۔ چھوٹے موٹے آپسی تنازعات چلتے پھرتے حل فرمادیا کرتے تھے۔ تعلیم وتبلیغ اور مصالحت ومحبت ان کا پیام تھا، جس کو وہ ہر خاص وعام کے دل میں اتارنے کی سعی کرتے رہتے تھے۔ ان کے محبین وشاگردوں کے لئے یہی سب ان کی وراثت ہے اور یہی ان کی وصیت بھی سمجھنی چاہئے۔

پسماندگان

حضرت علامہ صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی موجود ہیں جو ماشاءاللہ سب اصحابِ اولاد ہیں۔ بیٹے اور داماد تینوں عالم دین ہیں، چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد مصطفیٰ صاحب اخلاق واطوار میں والد محترم سے خاصی مشابہت رکھتے ہیں، متحرک اور صالح نوجوان ہیں، مدرسہ بھیسانی میں مہتمم ہیں۔ بڑے صاحبزادے جناب مولانا محمد الیاس صاحب اور داماد جناب مولانا محمد جابر صاحب بھی بھیسانی مدرسہ میں ہی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جامعہ فلاحِ دارین الاسلامیہ، بلاسپور ضلع مظفر نگر

اکابرین امت کی دعاؤں کے زیر سایہ، صالح قدیم ونافع جدید کے اصول پر قائم ہونے والا اور بزرگانِ ملت کی سرپرستی ونگرانی میں چلنے والا شمالی ہند کا منفرد اور عظیم ادارہ

جس میں ابتدائی دینی تعلیم سے لیکر درجاتِ حفظ وتجوید قرآن کریم، درجاتِ فارسی وعربی (تا پنجم عربی) کی معیاری تعلیم اور اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ کے ساتھ انٹرمیڈیٹ (بارہویں کلاس) تک عصری علوم کی عمدہ تعلیم کا بھی بہترین انتظام ہے۔ جوحکومت سے باقاعدہ منظور شدہ ہے۔

ساتھ ہی کمپیوٹر سینٹر اور زنانہ دستکاری کا مرکز بھی الگ سے قائم ہے، جن سے طلباء وطالبات بڑی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں۔

یہ ادارہ اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں پر طلباء کو پورے نظم وضبط (Discipline) کے ساتھ رکھ کر عملی زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے اندر شریعت وسنت کی محبت وعظمت اور ان کی اتباع کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کا مؤثر نمونہ اور داعی بن سکیں۔ ساتھ ہی جامعہ کے تحت ایک مستقل عمارت میں انٹر کالج کا انتظام اس لئے کیا گیا ہے تاکہ ہمارے نونہال دینی ماحول میں رہ کر اپنے ایمان وعقائد کی حفاظت کے ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کرسکیں جو وقت کی اہم ضرورت ہے اور خیر امت کے سپوتوں کو تعلیم کی بھیک مانگنے کیلئے دوسروں کے دروازوں پر نہ جانا پڑے۔ ان کو اپنی متاعِ دین اور عزتِ نفس کو گنوا کر دوسروں کے کالجوں میں ذلت کے ساتھ اور گالیاں کھا کر تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے جیسا کہ رات دن برادرانِ ملت کو اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہوتا رہتا ہے۔

ہمارے یہاں کالج میں اردو اور دینیات کی تعلیم بھی لازمی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم و تربیت کی جڑیں صفۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مضبوط ہوں اور ہم اپنی اس مقدس امانت کی حفاظت کے ساتھ سائنس و ٹیکنالوجی میں بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کا لوہا منوائیں۔

جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ اسی جذبہ کے تحت قائم کیا گیا ہے۔

جائے وقوع

مظفرنگر شہر سے تقریباً دو کلو میٹر مشرق میں جولی روڈ پر موضع بلاسپور میں (مظفر نگر بائی پاس سے متصل) لب سڑک ہی کشادہ اراضی پر جامعہ کی عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ نئے مہمانوں کی رہنمائی کے لئے بائی پاس پر جامعہ کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔

خط و کتابت اور رابطے کے لئے

مولانا ممشاد علی صاحب قاسمی

جامعہ فلاحِ دارین الاسلامیہ بلاسپور، ضلع مظفرنگر یوپی

MAULANA MUMSHAD ALI QASMI

JAMIA FALAH-E-DARAIN AL-ISLAMIA

BILASPUR DISTT. MUZAFFAR NAGAR

(U.P.) 251001 (INDIA)

PH: 0131-404543, 401879, 602724

ایک عالمی شخصیت پر عالمی معیار کی شاہکار کتاب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
اکابر و مشاہیر امت کی نظر میں

تالیف : مولانا ممشاد علی صاحب قاسمی

شیخ العالم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے متعلق عالم اسلام کے اکابرین، علمائے کرام، مشائخ عظام، مشاہیر امت، قائدین ملت، سربراہان مملکت اور دنیا کی بعض اہم ترین شخصیات کے تأثرات، اعترافات، مبشرات و مکتوبات اور تاریخی اعزازات واقدامات پر مشتمل ایک بابرکت و مستند دستاویز۔

جو حضرت مولانا قدس سرہ کی زندگی کے بعض اہم واقعات، مشاہدات و تجربات، افکار و ارشادات طویل و عمیق مطالعہ کی روشنی میں اہم مشوروں اور پیغامات نیز تاریخی خطبات کے بعض اہم اقتباسات پر محیط ہونے کی وجہ سے "جام جہاں نما" کی حیثیت رکھتی ہے۔

عام قیمت:۔ ۱۷۵/ روپے

طلباء، مدرسین اور مدارس و لائبریریوں کے لئے خصوصی رعایت

علمی، دینی، اصلاحی، ادبی کتابوں اور ہر قسم کے رجسٹر، کاپیاں وغیرہ حاصل کرنے کا قابل اعتماد مرکز

MAKTABA MURSHIDUL UMMAT
JAMIA FALAH-E-DARAIN AL-ISLAMIA
BILASPUR, DISTT. MUZAFFAR NAGAR (U.P) PH:0131-404543, 40...

Designed by Crescent Computers, Deoband, Ph: 013...